جولائی تا ستمبر ۲۰۲۵ء

سہ ماہی

حاشیہ

حاشیائی اظہار کا تخلیقی حوالہ

اورنگ آباد، مہاراشٹر (انڈیا)

مدیر

ڈاکٹر ہاجرہ بانو

حاشیائی قوس قزح

کوزۂ بحر (اداریہ)

اپنی بات	ڈاکٹر ہاجرہ بانو	3

بادنخلستان (مضامین)

ہماری شادیاں اور اخراجات	آپا منزہ جاوید	4
فیض احمد فیض	ڈاکٹر عرفانہ بیگم	6
اعلیٰ تعلیم میں جانچ کا عمل	ڈاکٹر عرفانہ بیگم	14

چشم سہ (تبصرہ)

گردشِ خیال	رئیس احمد کمار	18
صنعت لف ونشر	اسلم مرزا	20

صدف عناب (افسانے، کہانیاں، افسانچے)

سکیسر کی بتیاں	وقار احمد ملک	24
دراڑ	غلام مجتبیٰ اعوان	28
ہدایت	افراء تسکین خان	29
افسانچے	محمد جاوید خادم	31
فنا سے بقا تک	ڈاکٹر محمد عظیم الدین	33
نورِ باطن	ڈاکٹر محمد عظیم الدین	35
سو سال کی مسافت	غلام مجتبیٰ اعوان	37

شہابِ ساقی (حمد، نعت، نظمیں، غزلیں)

حمد	محمد جاوید خادم	39
نعت	سیدہ زینب سروری	40
غزل	اختر چیمہ	41
غزل	یاور حبیب	41
نظم (بہار)	محمد نعیم خان	42
غزل	عبدالرحیم ارمان	43
غزل	ڈاکٹر ممتاز منور	43
نظم (تو اپنا ہوگا)	سدھا کرمانو	44

سہ ماہی

حاشیہ

مدیر:

ڈاکٹر ہاجرہ بانو

جلد نمبر : 06

شمارہ نمبر: 02

جولائی تا ستمبر ۲۰۲۵

اورنگ آباد، مہاراشٹر، انڈیا

تزئین و ترتیب:

گلزار خالد اعظمی

ہاجرہ بانو

اپنی بات

زبان صرف ایک بولی ہی نہیں زندگی کا ایک اہم عنصر ہے۔ جو بھی انسان زبان استعمال کرتا ہے اس میں اپنی بساط کے مطابق گوہر و جواہرات کا اضافہ کرتا جاتا ہے۔ زبان میں ہماری تاریخ، تجربہ، مشاہدہ، تہذیب وتمدن کی تمام لڑیاں پروئی ہوئی ہیں۔ زبان کا ہر لفظ زندہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے دامن میں خود اپنی تاریخ سموئے ہوئے رہتا ہے۔ زبانوں کا تعلق صرف بولنے والے کی ذات سے ہوتا ہے۔ نہ ہی کسی ملک سے اور نہ ہی کسی مذہب سے۔ زبانوں کا کوئی ملک اور مذہب نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی سرحد اسے باندھ سکتی ہے۔ بلکہ ملکوں اور مذاہب کو ہی زبانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ زبانیں عوام میں اظہار خیال کا آسان ذریعہ ہوتی ہیں۔ یہ زبانیں ہی ہوتی ہیں جو اپنے خیالات اور افکار کو دوسروں تک پہونچانے کا راستہ ہموار کرتی ہیں۔ آج زبانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ دیگر زبانوں کا وجود بھی متزلزل نظر آ رہا ہے۔ کئی زبانوں کا رسم الخط قریب الختم محسوس ہو رہا ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا جتنا ہمیں ترقی پذیر بنا گئی اتنا ہی زبانوں کے اطراف محدود شکنجہ کستی چلی گئی۔

آج ضرورت ہے کہ ہم اپنی مادری زبانوں میں صبح سے رات تک ہر ضروری کام انجام دیں۔ نہ صرف ضروری بلکہ زبان کے لئے بھی کچھ اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کریں۔ جو کام آپ کو غیر ضروری لگتے ہوں گے یقین جانیے زبان کی ترقی وترویج کے لئے ایسی سرگرمیاں آکسیجن کا کام کرتی ہیں۔ اب وقت کا تقاضا ہے کہ اس آکسیجن کے سلینڈر کی نلی کو آپ بروقت استعمال کریں اور اپنی مادری زبان کو مرنے سے بچائیں۔ سوشل میڈیا پر اپنی مادری زبان میں تنقید وتبصرہ کریں۔ اپنی تجاویز پیش کریں۔ حوصلہ افزائی اور قدر شناسی کے قابل تحسین الفاظ سے نوازیں۔ اپنے کمنٹس اپنی مادری زبان میں ضرور دیں۔ اگر آپ بہت مصروف رہتے ہیں تو مختصر ہی سہی لیکن اپنے کمنٹس دے کر سامنے والے کی حوصلہ افزائی ضرور کریں۔ آپ کی تعریف اور قدر شناسی زبان کے ساتھ ساتھ قابل اور با اہل افراد کے لئے جام اکسیر ہے۔ زبان ہماری میراث ہے اسے ہمارے اسلاف نے ہم تک سجا سنوار کر پہونچایا ہے۔ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے مزید سجا سنوار کر اگلی نسل تک پہونچائیں۔

اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہماری مادری زبان اردو کی اہمیت کو ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کی تعلیم میں اردو کو بطور ایک مضمون شامل کر سکتے ہیں۔ جہاں بھی جدھر بھی اردو کا کوئی رسالہ، کتب خانہ، مشاعرہ، سمینار، مذاکرہ، فنکار، اخبار، ڈرامہ، فلم، سیریز، ڈائیلاگ، خبر، پروگرام، میلے، نکڑ ناٹک، یا کوئی ادارہ نظر آئے اس کی تشہیر ضرور کر سکتے ہیں۔ مرکزی وریاستی حکومت کی جانب سے اردو زبان کے لئے کی جانے والی کاوشوں کی سراہنا کر سکتے ہیں۔ اپنے گھروں، دکانوں اور آفس پر اردو زبان میں جلی حرفوں میں بورڈ لگا سکتے ہیں۔ اگر تجارتی نقطہ نظر ملحوظ خاطر رکھنا چاہتے ہیں تو بورڈ پر دو سے زائد زبانوں میں بھی لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن سرفہرست اردو میں لکھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا اور یہ صرف ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ اسے کوئی اور نہیں انجام دے سکتا۔ پھر دیکھیں اردو زبان کی ترقی کیسے پرواز کرتی ہے۔ اپنی زبان کو خود عزت دے کر تو دیکھیں معاشی ذرائع کے دروازے بھی اپنے آپ کھلیں گے اور آپ بھی سینہ تان کر کہہ سکیں گے کہ ”ہاں! اردو میری زبان ہے۔“

اداریہ

ہماری شادیاں اور اخراجات

منزہ جاوید

شادی ایک مبارک دن ہے خوشیوں کا دن ہے۔''شادی'' لفظ ہے ہی ایسا کہ کنوارے حسرت اور خوشی سے سنتے ہیں اور شادی شدہ کے لیے ایک عام سا لفظ.................!

لیکن کچھ بھی ہو شادی سنت ہے خوشیوں بھرا دن ہوتا ہے۔ یہ ہر فرد کے لیے ہی خوشی اور سکون کا باعث ہے۔ شادی لفظ کے نام سے ہی دھوم دھڑ کے، ڈھول باجے کی آوازیں، گھر کی رونقیں دیکھائی دینے لگتی ہیں۔ ایک خوشی کی لہر دل و دماغ میں دوڑ جاتی ہے۔

جیسے ہی شادی کے دن رکھے جاتے ہیں گھر میں خوشیوں کے ساتھ مصروفیات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کے گھر شادی ہے یا جنھوں نے شادی کرنا ہے، سبھی کے بازار کے چکر لگنے شروع ہو جاتے ہیں کوئی اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کی چیزیں، لوازمات پورے کرنے میں لگ جاتے ہیں اور شادی میں شرکت کرنے والوں کو سنبھالنے، بیٹھانے، سونے، آرام، ان کی خاطر مدارت کیسے ہو، ان کی مدارات میں کوئی کمی نہ رہ جائے کی ذمہ داری میں تھک رہے ہوتے ہیں۔ کوئی خرچے کے بوجھ تلے پریشانی میں مبتلا زیادہ اخراجات کیسے کہاں سے پورے ہوں گے سوچ رہے ہوتے ہیں۔ اور کچھ شادی میں شرکت کیسے کریں۔ میں کون سا لباس زیب تن کروں۔ اور میرا لباس سب سے زیادہ پیارا دیں، اس کے چکر میں تھک رہے ہوتے ہیں۔ گو کہ ہر اِک کی ذمہ داری، فکر علاحدہ علاحدہ ہوتی ہے ہر کوئی شادی کی تقریب کو اپنی نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے...... کسی کے لیے یہ خوشیاں سہولت بنی ہوتی ہیں اور کسی کے لیے دردِ سر ہوتی ہیں۔ خاص طور پر جو بیمار ہوتے ہیں یا بزرگ ہوتے ہیں یا جن کے بچے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے شادی میں شرکت کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم موسم کے مطابق شادی کے لیے وقت رکھیں جیسے ہمارے ملک میں سخت سردی اور سخت گرمی ہوتی ہے تو جو لوگ دسمبر جنوری میں شادی رکھتے ہیں انہیں چاہیے وہ شادی کی تقریب دن کے وقت رکھیں کیونکہ سردی کے موسم میں دن کی نسبت رات کو سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو بوڑھے، بیمار اور جن کے بچے چھوٹے ہیں ان کے لیے سردی کی راتوں میں شادی میں شرکت کرنا مشکل بن جاتا ہے سردی کے دنوں میں شادی میں شرکت کے بعد کئی دنوں تک شمولیت کرنے والے ڈاکٹروں کی طرف چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اور موسم سرما کے دن چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور اس کی راتیں گہری اندھیری اور خاموش ہوتی ہیں۔

جن لوگوں کی لڑکی کے سسرال والے کسی دوسرے شہر سے آنے ہوتے ہیں وہ رات کو دیر سے واپس جاتے ہیں اور سردی کے موسم میں رات

کا وقت ان کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی امان میں رکھے۔کوئی مسئلہ بن سکتا ہے۔ کوئی چوری چکاری کوئی اللہ نہ کرے ایکسیڈنٹ کوئی گاڑی خراب ہو سکتی ہے۔ تو ایسے میں دونوں گھرانوں کے لیے مسئلے بنتے ہیں خوشی پریشانی میں بدل سکتی ہے۔تو موسم سرما میں جتنا ہو سکے شادیاں دن میں رکھیں۔تاکہ کسی ناگہانی آفت پریشانی دکھ سے بچ سکیں۔

اسی طرح جو لوگ اپریل مئی جون میں شادی رکھتے ہیں ان کو تو طویل دن مل جاتے ہیں دن کی روشنی میں خیر سے شام تک سارے کام نبڑ جاتے ہیں۔

گرمیوں میں گرمی کی شدت کی وجہ سے کھانا خراب ہونے کا چانس بھی زیادہ ہوتا ہے تو اگر دن دن میں شادی انجام پاتی ہے تو وہی کھانا رات کو بھی استعمال میں آ جاتا اسے سنبھالنے کا جھنجھٹ نہیں ہوتا اور دوسرا لڑکی اور لڑکے والوں کی گھر واپسی جلدی ہونے کی وجہ سے سب گھر والے اور مہمان پر سکون رہتے ہیں۔تھکاوٹ کم ہوتی ہے۔سب گھر آ کر رات کا کھانا کھا کر سکون سے اپنی نیند پوری کرتے ہیں۔

یوں تو شادیاں سارا سال ہوتی ہیں لیکن جو شادیوں کا رش چھوٹی عید یعنی ”عید الفطر“ سے پہلے اور رمضان المبارک کے بعد کے مہینے میں ہوتا ہے اتنا رش سارا سال میں نہیں ہوتا۔

شادی ہونی تو بے شک حکم ربی سے ہے لیکن جب بھی شادی کے لیے دن رکھیں ایسے دن رکھیں جب نہ زیادہ گرمی ہو اور نہ زیادہ سردی۔اب پہلے والے رسم رواج ماحول نہیں رہے۔

گزرے وقتوں میں اور رواج تھے۔شادی ایک گھر ہوتی تھی لیکن سارے محلے میں رونق چہل پہل ہوتی ساری گلی مہمانوں کو سنبھالنے میں مدد کرتی تھی اب نہ وہ رواج رہے، نہ پہلے والے مخلص لوگ، اب تو جو کرنا ہے خود گھر والوں نے کرنا ہے۔تو ایسے دن رکھیں جس کو آپ صحت اور خوشی سے سنبھال سکیں۔کیونکہ شادی بہت سی ذمہ داریوں کا نام ہے شادی میں سارے گھر کی سو کر اٹھنے، کھانے پینے کی روٹین وہ نہیں رہتی جو عام دنوں میں عادت بنی ہوتی ہے۔بچے، بوڑھے، بیمار ہر گھر میں ہوتے ہیں ان کی صحت کو دیکھتے ہوئے اپنے خوشیوں کے دن رکھا کریں تاکہ سب خوشی خوشی اس میں شرکت کریں۔کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے بچا سو خوشیوں پے ایک پریشانی بھاری ہو جاتی ہے۔رنگ میں بھنگ پڑ جاتا ہے لہذا شادی کیا زندگی میں جو بھی ایسا کام کریں جس میں بہت سے لوگوں نے شرکت کرنا ہو تو خوب سوچ سمجھ کر دن کو چنا کریں وہ دن صرف آپ کے لیے نہیں ہوتا ان سب کے لیے اہم ہوتا ہے جنھوں نے شرکت کرنا ہوتی ہے۔دوسرا اب شادیوں کی تقریبات آٹھ آٹھ دنوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن میں تھکاوٹ کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔اور دیکھا دیکھی جن کی آمدنی اتنے دنوں کے خرچے کو برداشت نہیں کر سکتی وہ بھی ادھار لے کر ایسا کرتے ہیں جو ہمارے گھریلو سکون کو خراب کر رہا ہے کوشش کیجئے اپنی خوشیوں کی تقریبات میں سادگی لائیں، آسانی لائیں، فضول کی رسومات سوائے خرچوں میں اضافے کے کچھ بھی نہیں، ہم لوگ واقعی نمود و نمائش کے لیے اپنے اوپر اس قدر زیادہ اخراجات کا بوجھ لاد لیتے ہیں پھر بعد میں پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔کفایت شعاری سے کام لیجئے خود بھی خوش رہیں اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دیں۔

□□□

آپا منزہ جاوید
اسلام آباد پاکستان
+923495315484

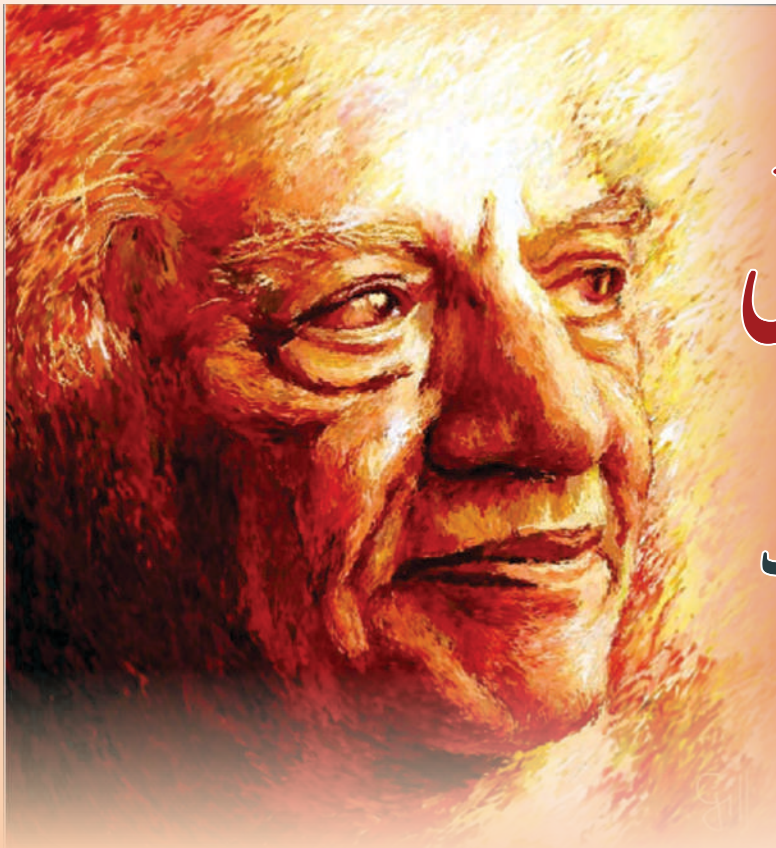

فیض احمد فیضؔ کی نظموں کے موضوعات

ڈاکٹر عرفانہ بیگم، اسوسیٹ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو
کے۔وی۔آر گورنمنٹ کالج فار ویمن اٹانومس کرنول۔ آندھرا پردیش

بیسویں صدی میں اردو شاعری کے ایک نئے دبستان کا بانی فیض احمد فیضؔ، جس نے جدید اردو شاعری کو بین الاقوامی شناخت سے ہمکنار کیا اور اپنی تخلیقی انفرادیت کا احساس دلایا۔ عالمی سطح پر اردو زبان وادب کو قابلِ صدرشک بنانے کی وجہ سے فیض احمد فیضؔ کو مرزا غالبؔ اور علاّمہ اقبال جیسے عظیم دانشوروں کی صف میں کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ فیض کو ایک عہد ساز شاعر کے طور پر بھی جانا جاتا ہے علاوہ ازیں فیض اس لحاظ سے بھی اپنے معاصر شعراء سے ممتاز نظر آتے ہیں کہ انھوں نے شاعری میں جدید موضوعات کا اضافہ کیا اور شعر و نغمہ کو انقلابی پیرہن عطا کیا اور تنقیدِ حیات کے فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے عشق کے روایتی تصور کو بدل ڈالا اور اپنے مجازی محبوب کی محبت میں گرفتار ہونے کے بجائے استحصال زدہ عوام کی محبت کو متاعِ حیات تصور کیا۔ غنائیت اور رجائیت فیض کی شاعری کے امتیازی عناصر ہیں۔ خوابوں اور حقیقتوں، اُمیدوں اور نامرادیوں کی کشاکش نے ان کی شاعری میں گہرائی اور تہ داری پیدا کی ہے۔ ان کا عشق دردمندی میں ڈھل کر انسان دوستی کی شکل اختیار کرتا ہے اور پھر یہ انسان دوستی ایک بہتر دنیا کا خواب بن کر اُبھرتی ہے۔ ان کے الفاظ اور استعاروں میں اچھوتی دلکشی، سرشاری اور پہلوداری ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فیض نے شاعری کا ایک نیا دبستان قائم کیا۔ اردو شاعری میں علامہ اقبال کے بعد جن تخلیق کاروں نے ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کو معنویت عطا کی اور ظلم و جبر کی دیرینہ روایت کے خلاف مظلوم اقوام کی مضبوط آواز بن کر اُبھرے ان انقلابی شاعروں میں فیض احمد فیضؔ کا نام اوّلین اہمیت رکھتا ہے اس لئے انھیں تیسری دنیا کے عوام کا نمائندہ شاعر بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا کیا پایا ہے　　جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی　　یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا　　سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے

فیض احمد فیضؔ کی شاعری کا آغاز رومانیت سے ہوا جب وہ اٹھارہ سال کے تھے۔ ان کی پہلی نظم ''میرے معلوم قاتل'' دسمبر1929ء، میں گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین میں شائع ہوئی۔ ان دنوں رومانی رجحان اردو شاعری میں عروج پر تھا۔ فیضؔ اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کی رومانی شاعری سے متاثر تھے۔ انھوں نے شاعری کی ابتداء روایتی غزل گوئی سے کی لیکن جلد ہی وہ اس ڈگر سے ہٹ کر نظم کے میدان میں آ گئے اور اپنی اچھوتی طرزِ فکر، ندرتِ بیان اور نئے موضوعات سے ایک نئی راہ کی بناء ڈالی۔ مگر فیضؔ نے جو نظمیں لکھیں وہ کسی رومانی شاعر کی صدائے بازگشت ہونے کے بجائے ایک نوجوان کے عشقیہ تجربات اور واردات پر مبنی ہیں۔ کیونکہ فیض احمد فیضؔ کی بنیادی شناخت ایک ترقی پسند شاعر کی ہے اس لئے ترقی پسند شاعری کے موضوعات جا بجا ان کی شاعری میں ملتے ہیں مگر ان موضوعات کو بھی فیضؔ نے بالعموم جمالیاتی اور فنی حسن کے ساتھ الفاظ کے پیرہن میں ڈھالا ہے۔ بعض انگریزی رومانی شعراء کے اثرات بھی ان کی نظموں میں دکھائی دیتے ہیں ''نقشِ فریادی'' کا پہلا حصہ ان ہی نظموں پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری کی روایتی ہیتوں کے ساتھ انگریزی شاعری سے بھی استفادہ کیا۔ جس میں مشہور نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' سے دوسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ جو مروجہ معاصر ترقی پسند موضوعات ہیں۔ لیکن اس حصے کی بعض موضوعاتی نظمیں عام ترقی پسند شاعری کی روش سے مختلف ہیں ۔ مثلاً ''رقیب سے''، ''تنہائی''، ''موضوعِ سُخن'' وغیرہ۔

فیض احمد فیضؔ نے مختلف مکاتب ہائے فکر و فن سے استفادہ کیا ہے اور زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے۔ 1943ء میں فیض میجر اور 1944ء میں لفٹنٹ کرنل رہے۔ فوج میں بہترین کارکردگی کے عوض حکومتِ برطانیہ نے فیض کو 1946ء میں ایم۔ بی۔ ای Member of order of British Empire(M.B.E) کا خطاب دیا۔

اس خطاب کے بارے میں ڈاکٹر ایوب مرزا کو فیض نے بتایا کہ

''ہم نے اسے فاشزم کے خلاف اپنے جدوجہد کی کامیابی تصور کیا''۔

1946ء میں فیض فوجی خدمات سے مستعفیٰ ہو گئے اور 1947ء سے انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' سے وابستہ ہو گئے۔ پھر روزنامہ ''امروز'' کے اڈیٹر مقرر ہوئے اس کے علاوہ ویکلی ''لیل و نہار'' کے چیف اڈیٹر بھی رہے۔ وہ اپنے خیالات اور نظریات کے اعتبار سے اشتراکی تھے اس لئے حکومت سے ان کی نبھ نہ سکی چنانچہ عرصہ تک حکومت کے عتاب کا شکار رہے۔ 1948ء میں میجر جنرل اکبر خاں نے انھیں راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کر کے جیل میں بند کر دیا لیکن الزام ثابت نہ ہوسکا چنانچہ چار سال بعد انھیں جیل سے رہا کیا گیا۔ ایک بار پھر وہ جیل گئے۔ فیض کو قید و بند کی صعوبتیں بہت زیادہ اُٹھانی پڑیں۔ فیض نے کئی بیرونی ملکوں کا سفر بھی کیا جیسے انگلستان، روس، الجیریا، مصر، لبنان، اور ہنگری وغیرہ کچھ عرصہ فلسطین میں بھی رہے۔ فیض کو سرزمینِ

فلسطین سے بڑی عقیدت تھی وہ اس کو اپنا وطنِ ثانی تصور کرتے تھے۔ فلسطینیوں کے ساتھ ہو رہے ظلم و جبر پر بھی آپ نے قلم اُٹھایا۔ سر وادئ سینا میں فلسطینی

شہداء، فلسطینی بچے کے لئے لوری، اک ترانہ مجاہدِ فلسطین کے لئے جیسی نظمیں لکھیں۔

تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطین برباد
میرے زخموں نے کئے کتنے فلسطین آباد

فیض احمد فیض کو اُن کی ادبی خدمات کے صلہ میں انھیں بہت سے انعامات اور عالمی ایوارڈس سے نوازا گیا۔ 1962ء میں سویت یونین نے انھیں ''آرڈر آف لینن'' جیسے سرکاری اعزاز سے نوازا جو اس وقت کی ذو قطبی دنیا میں نوبل انعام کا بدل تصور کیا جاتا تھا۔ 1964ء میں فیض سر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 1972ء میں فیض پاکستانی قومی ادبی اکیڈمی کے صدر مقرر ہوئے۔ 1976ء میں ان کو ادب کا ''لوٹس'' انعام دیا گیا اور 1979ء میں بیروت میں انگریزی میگزین ''لوٹس'' کے مدیر بنے۔ 1981ء میں ہندوستان کے مختلف مقامات چندی گڑھ، دہلی، لکھنو، الہ آباد، بھوپال اور ممبئی میں جشنِ فیض منایا گیا۔ جولائی 1984ء میں لندن میں فیض سمینار رہا جس میں فیض بھی شریک رہے۔ ان کو نوبل انعام کے لئے بھی نامزد کیا گیا تھا لیکن کسی فیصلہ سے پہلے 20 نومبر 1984ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ فیض کے انتقال کے بعد 1985ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے ڈاکٹر خلیق انجم نے پہلی کتاب فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ مرتب کی جس میں سوانحی مقالات، تنقیدی مضامین، انٹرویوز، منتخب کلامِ فیض کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے نامور مشاہیر ادب کے مضامین میں ممتاز دانشور سابق وزیر اعظم ہندوستان جناب اندر کمار گجرال کا مضمون '' بہ یادِ فیض '' بھی شامل ہے۔ 1990ء میں حکومت پاکستان نے ان کو ملک کے سب سے بڑے سویلین ایوارڈ ''نشانِ امتیاز'' سے نوازا۔ پھر 2011ء کو ''فیض کا سال'' مقرر کیا۔

فیض کی وفات پر صدر جمہوریہ ہند عالی جناب گیانی ذیل سنگھ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے تعزیتی پیام میں کہا کہ۔

''فیض عالمی شہرت یافتہ شاعر تھے ان کی شاعری ان کا نام زندہ رکھے گی۔''

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کہا کہ۔

''گزشتہ نصف صدی سے فیض، سرکردہ دانشوروں اور اردو کے صفِ اول کے شعراء میں شامل تھے۔ انھوں نے نہ صرف اردو شاعری اور ادب کو بلکہ نظریۂ حیات کو بھی روشنی بخشی ہے، وہ ایک ممتاز ماہرِ تعلیم اور ایک نامور صحافی تھے۔ انھیں ایک عظیم دانشور اور ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے تادیر یاد رکھا جائے گا۔''

مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون ''سرخ بر سیاہ'' میں فیض کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

ا۔ پہلا دور آزادی اور تقسیم سے قبل (نقشِ فریادی۔ پہلا شعری مجموعہ۔ ڈسمبر 1941)

۲۔ دوسرا دور آزادی اور تقسیم کے بعد (دستِ صبا۔ شعری مجموعہ 1952، زنداں نامہ۔ شعری مجموعہ 1956)

۳۔ تیسرا دور۔ فیض کے بیرون ملک سفر کی شاعری (دست تہِ سنگ۔ شعری مجموعہ 1965، سر وادیٔ سینا۔ شعری مجموعہ 1971، شامِ شہر یاراں۔ شعری مجموعہ 1978، میرے دل میرے مسافر۔ شعری مجموعہ 1981، کلامِ فیض۔ شعری مجموعہ 1982، سارے سُخن ہمارے۔ کلیات 1984، اور نسخۂ وفا۔ کلیات پاکستانی ایڈیشن 1984،

کلامِ فیض کے علاوہ نثر میں میزان (تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ 1963ء، صلیبیں میرے دریچے میں (اپنی بیوی ایلس کے نام۔ فیض کے

انگریزی خطوط کا اُردو ترجمہ)1972ء، متاعِ لوح وقلم۔نثری مضامین کا مجموعہ 1973ء،سفرنامہ کیوبا۔ 1974ء، ہماری قومی ثقافت۔1976ء، مہ و سالِ آشنائی (قیامِ روس کے نثری تاثرات) اس کے علاوہ ان کی زندگی میں ہی بے شمار ہندو پاکستان کے فیض نمبر، سمینارز اور کانفرنسز شامل ہیں۔ بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ فیض نے 1929ء میں لاہور ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے جن میں ’’ پرائیویٹ سکریٹری‘‘، ’’سانپ کی چھتری‘‘، ’’تماشہ میرے آگے‘‘ وغیرہ مشہور ہوئے ہیں۔انھوں نے دوفلموں ’جاگو ہوا سویرا‘ اور ’دور ہے سکھ کا گاؤں‘ کے لئے گیت اور مکالمے بھی لکھے۔جس کو بین الاقوامی ایوارڈ بھی ملا۔1968ء میں فیض نے کراچی میں ’’ادارہ یادگارِ غالب‘‘ قائم کیا اور اسی سال علامہ اقبال پر ایک فلم بھی بنائی۔

1941ء میں جب ان کا پہلا شعری مجموعہ ’’نقش فریادی‘‘ شائع ہوا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ن۔م۔راشد نے مجموعہ کا مقدمہ لکھا جس کا پہلا جملہ ہی اس قدر مقبول ہوا کہ آج بھی لوگ فیض کے متعلق معلومات کے لئے اسی کو بنیاد بناتے ہیں۔

’’نقش فریادی، ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔‘‘

فیض احمد فیض کی عشق میں ناکامی کے بعد پروفیسر رشید جہاں کی نصیحت اور ان کی طرف سے عنایت کردہ کتاب کارل مارکس کی کمیونسٹ مینی فیسٹو کے مطالعہ نے فیض کی زندگی اور شاعری میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا جو فیض کی شاعری میں زبردست موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔اس واقع کی یہ مشہور نظم جو حقیقت پسندی کے موڑ کا نقطۂ نظر کہلاتی ہے جس میں شاعر اپنے محبوب سے راست مخاطب ہے۔ملاحظہ ہو۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا   راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

’’نقش فریادی‘‘ کی نظموں کے بارے میں مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

’’نقش فریادی‘‘ کی نظموں کے تمام موضوعات عصری اور جدت وندرت میں اپنی انوکھی شان لئے ہوئے ہیں۔ باوجود اس کے ہر نظم اپنے آہنگ اور مزاج کے لحاظ سے شاعر کی انفرادی شخصیت کی تصدیق ہے۔ان نظموں میں ایک نئی آواز ملتی ہے۔جو رنگِ موسیقی اور درد کی ہلکی لہروں سے مل کر بنی ہے۔ان نظموں میں نہ ہجر ہے نہ وصال بلکہ ایسی انوکھی کیفیت ہے جو ان دونوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔۔۔۔نظموں کے لہجے میں شعری صداقت ہے غزلوں میں نظم کہنے کی کوشش ہے۔‘‘

فیضؔ فن کے تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔فیض کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور وہ ان تقاضوں کو نظموں میں پورا کرتے ہیں۔خواہ وہ رومان کی دنیا میں ہی کیوں نہ ہو۔مثلاً نظم ’’انتظار‘‘ کا یہ شعر

ریاضِ زیست ہے آزردۂ بہار ابھی   میرے خیال کی دنیا ہے سوگوار ابھی

فیضؔ کی نظموں کے موضوعات میں گہرائی اور فکری وقار ہے۔منظر کشی کا حسن اور احساس کی شدّت ہمارے دل پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ان کی

نظم ''تنہائی''میں سوگواری اور اداسی کی کیفیات اور شاعر کے احساسِ مطابقت نے اسے اردو کی بہترین نظموں میں جگہ دی ہے۔

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار　　لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کہ ہر ایک راہ گزر　　اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے چراغ

ان کے دوسرے مجموعے کلام دستِ صبا، زنداں نامہ، دست تہہ دست اور سروادیٔ سینا میں بعض نظمیں ایسی ہیں جن کے موضوع عشقیہ ہوتے ہوئے بھی سیاسی وسماجی ہیں۔ دستِ صبا 1953ء میں شائع ہوا جب وہ جیل میں تھے۔ جیل سے آنے کے بعد زندان نامہ منظرِ عام پر آیا۔ اس میں ان کی قید وبند کی یادگار نظمیں ہیں۔ اس وقت تک فیض کا فن پختہ ہو چکا تھا۔ ان کے احساسات میں شدّت اور شاعری میں اعلیٰ مقاصد وبلند خیالات ملتے ہیں۔ وہ اپنی بعض نظموں میں مظلوموں کو تسلی دیتے ہیں۔ یہ خلوص انھیں گدازِ قلب اور سچائی کی وجہ سے حاصل ہوا۔ ان کی نظم ''چند روز اور میری جان'' کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں　　اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں　　ہم کو رہنا ہے پہ یوں ہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم　　آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز

فیض کی نظموں میں قنوطیت نہ ہو کر رجائیت ہے۔ انداز سلجھا ہوا ہے ان کے یہاں کامیاب تمثیل نگاری ملتی ہے۔ نغمگی، ترنم وموسیقیت سے ان کی شاعری لبریز ہے۔ پُر لطف تشبیہوں واستعاروں سے وہ جیتے جاگتے پیکر تراشتے ہیں۔ ''بہار شمائل''، عنبریں آنکھیں''، ''آبشار سکوت''، ''شب گزیدہ سحر'' جیسی تراکیب اور امیجریز فیض کی تخلیقی صلاحیت کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی شاعری کا کینواس اقبال کی طرح خاصا وسیع ہے اور ان کے موضوعات میں آفاقیت ہے ان کی ہمدردیاں نہایت وسیع ہیں۔ وہ لفظوں کا دلکش انتخاب کرتے ہیں۔ فیض کی خالص انقلابی نظموں میں فنی رچاؤ، ایمائیت، موسیقیت، وزن کا اُتار چڑھاؤ انھیں دلکش فن پارہ بنا دیتا ہے۔ ان کی نظم ''بول'' کے اشعار اس طرح ہیں۔

بول کے لب آزاد ہیں تیرے　　بول زباں اب تک تیری ہے
دیکھ کے آہن گر کی دکان میں　　تند ہیں شعلے سُرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے　　پھیلا ہر ایک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے　　جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک　　بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

ان کی نظمیں صبح آزادی، ۱۵ اگست ۱۹۵۲ء، نثار میں تیری گلیوں کے، شیشوں کا مسیحا، رقیب سے، مرے ہمدم مرے دوست، سیاسی لیڈر کے نام، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، ایرانی طلباء کے نام، سوچ، اے دلِ بے تاب ٹھر، لوح وقلم، دو آوازیں، سرِ مقتل وغیرہ ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ اے دلِ بے تاب ٹھر، میں ماحول کی بدلتی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو　　یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر

صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر

فیضؔ کی شاعری کے تجزیاتی مطالعہ کی تعریف میں ن۔م۔راشد کچھ اس طرح رقم طراز ہیں۔

’’ فیض اپنے تصورات سے اپنے لئے خالص حسن کا ایک ایسا دلکش بہشت پیدا کرنا جانتا ہے۔خمارِ خواب سے لبریز نرگسی آنکھیں، رخساروں کے عشرت آلود غازے، سرخ ہونٹوں پہ تبسم کی ضیاء، مرمریں ہاتھوں کی لرزشیں، مخملیں باہیں، رنگین پیراہن، دمکتے ہوئے رخسار اور جھلکتے ہوئے آنچل اس کی دنیا میں بار بار آتے ہیں۔وہ انہیں الفاظ کے مجموعے سے ایک حسینہ،خیال کا مجسمہ تعمیر کر دیتا ہے۔پھر اس حسینہ کو کسی نیم تاریک، نیم خواب شبستان میں بٹھا کر اس سے اپنا انتظار کراتا ہے۔‘‘تو ان سے اختلاف کی گنجائش کم رہتی ہے بلکہ اتفاق کرتے ہی بنتی ہے۔

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی جب کھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے ، لائے جہاں تک قدم لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی تیرے حسن کی دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

فیض احمد فیضؔ کی موضوعاتی نظموں کا کمال یہ ہیکہ انھوں نے سخت سے سخت بات کو بھی نرم شیریں بنا کر شاعری کے پیرائے میں اسطرح ڈھالا کہ موضوع کا حسن دوبالا گیا۔یہ کمال فن بجز مجروحؔ سلطان پوری اور فیضؔ کے کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس قبیل کی چند مشہور نظمیں ’ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ، کچھ عشق کیا کچھ کام کیا، وبیقی وجہ ربک (ہم دیکھیں گے)، رقیب سے، بول، آج بازار میں پابہ جولاں چلو، نثار میں تیری گلیوں کے، بہار آئی، صبحِ آزادی (اگست 1947)، تنہائی، یاد، میرے ہمدم میرے دوست!، چند روز اور میری جان، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، اس وقت تو یوں لگتا ہے، کتے، انتساب، ڈھاکہ سے واپسی پر، دعا، دو عشق، لوح و قلم، پاس رہو، ترانہ، درد آئے گا دبے پاؤں، آخری

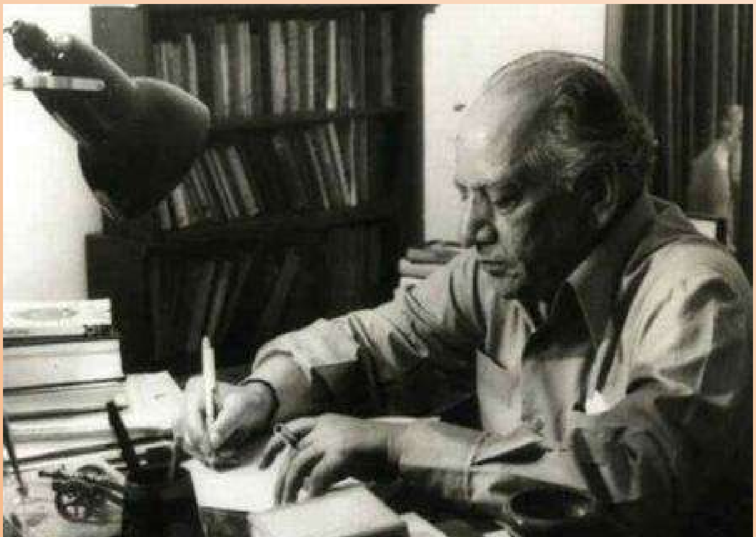

خط، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول، موضوعِ سخن، یہ فصل اُمیدوں کی ہم دم، جب تیری سمندر آنکھوں میں، دل من مسافر من، ہم تو مجبورِ وفا ہیں، ملاقات، تم اپنی کرنی کر گزرو، کوئی عاشق کسی محبوبہ سے، جو میرا تمہارا رشتہ ہے، آج اک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے، رنگ ہے دل

کامرے، خدا وہ وقت نہ لائے، زنداں کی ایک شام، ہارٹ اٹیک، واسوخت، مرے درد کو جو زباں ملے، آج کی رات، تم ہی کہو کیا کرنا ہے، انتظار، گیت، ایک رہگزر پر، غم نہ کر،غم نہ کر، تمہارے حسن کے نام،اک ترانہ مجاہدِ فلسطین کے لئے، واہ مرے وطن وغیرہ۔اس کے علاوہ آپ کی بے شمار موضوعاتی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے حالات سے مطمئن نہیں تھے اور موجودہ سیاسی نظام کو بدلنے کی تمنا رکھتے تھے۔وہ ایک ایسے انقلاب کے خواہاں تھے جس سے محنت کش طبقہ کو اس کا حق مل سکے اور ہر شخص آسودہ زندگی بسر کر سکے۔فیض نے ان نظریات کو جوش وخروش اور گھن گرج سے پیش نہیں کیا بلکہ ان کے اشعار میں ایک دھیمی آنچ اور سلگنے والی کیفیت ملتی ہے باوجود اس کہ ان کے اشعار نرم، لطیف، سبک اور دلنشین ہوتے ہیں۔وہ ظلم و جبر کی مکروہ روایات،غاصب انگریزوں کے شرمناک مظالم،سرمایہ دارانہ نظام کی بھٹی میں جھلس رہے غریب کسان ومزدور اور پامال ہو رہی انسانیت کے چشم کشا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے جس نے انھیں سخت ترین ذہنی اضطراب میں مبتلا کر دیا اور جب اس اضطراب نے شدت اختیار کی تو یہ انقلابی نغمے فضاؤں میں گونجنے لگے۔

اے خاک نشینو ں اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے   جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں   جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
اے ظلم کے مارو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک   کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

فیض احمد فیض کی شخصیت اس لحاظ سے بھی عہد ساز تصور کی جاتی ہے کہ ان کے افکار ونظریات اور ان کے کردار ونظریات میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ جب صدیوں کی جدوجہد کے بعد ہند کے اُفق پر آزادی کا سورج طلوع ہوا تو چہار جانب ایک عجیب منظر تھا فیض نے اس تاریخی موقع پر ہزاروں معصوم شہریوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ’’صبح آزادی‘‘ کے عنوان سے فکر انگیز کلام تخلیق کیا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر   وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر   چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل   کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

شکیل الرحمٰن اپنے مضمون ’’فیض کی جمالیات‘‘ میں لکھتے ہیں۔

’’فیض احمد فیضؔ نے اردو اور فارسی شاعری کی روایات سے اپنا تخلیقی رشتہ قائم کیا تھا۔انھوں نے کلاسیکی لفظوں اور پیکروں کو نئی معنویت عطا کی، کلاسیکی اردو اور فارسی شاعری کے جو الفاظ اپنے تجربوں کے اظہار کے لئے منتخب کئے ان کی وسعتوں اور گہرائیوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔خود ان لفظوں میں بہت سے جمالیاتی تجربے پہلے سے موجود تھے۔لیکن فیض نے جہاں اپنے جمالیاتی احساس وفکر سے معنوی تبدیلی کی وہاں اکثر معنوی پہلو بھی تبدیل کئے۔یہ ان کے تخلیقی تخیل کا کرشمہ ہے۔‘‘

فیض احمد فیضؔ کی موضوعاتی نظمیں معنوی اور فکری خوبیوں کے ساتھ ساتھ فیض کی فنکارانہ بصیرت کا پتہ دیتی ہیں۔فیض نے ماضی کے ادبی ورثے اور کلاسیکی روایات سے انحراف کرنے کے بجائے ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔نیز ادبی روایات اور لسانی وصوتی موزونیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نئ نئ

تراکیب، امیجریز اورتشبیہات وضع کیں۔فیض احمد فیضؔ کی موضوعاتی نظموں میں فنی ارتکاز واختصار اور معنویت سے بھرپور علامتوں کے استعمال سے تاثیروکشش کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔بعض اشعار میں فنی اور عروضی غلطیوں کی نشاندہی آثر لکھنوی اور دیگر نقادوں نے کی ہے لیکن فیض نے جس واقفیت، حقیقت پسندانہ معنویت، شاعرانہ صداقت اور جمالیاتی کیفیت سے اپنی شاعری کوزندگی اور تابندگی بخشی ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان معمولی تسامحات سے فیضؔ کی عظمت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔لینن ایوارڈ ملنے کے بعد فیض کی شہرت جو ابھی تک ہندوستان اور پاکستان تک محدود تھی ساری دنیا بالخصوص سویت بلاک کے ممالک تک پھیل گئی۔انھوں نے کثرت سے غیرملکی دورے کئے اور وہاں لیکچردیئے ان کی شاعری کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہونے لگے اور ان کی شاعری پر تحقیقی کام شروع ہوگیا اس طرح ان کی شاعری نے ان کی زندگی میں ہی سرحدوں، زبانوں، نظریوں اور عقیدوں کی حدیں توڑتے ہوئے عالمگیر شہرت اختیار کرلی تھی۔

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد فیضؔ, گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھری ہے۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔ فیض احمد فیضؔ از پروفیسر غیاث متین
۲۔ فیض کی نظموں کی تفہیم از پروفیسر غیاث متین
۳۔ فیض نمبر از مرتبہ صابردت
۴۔ نقش فریادی از مقدمہ ن۔م۔راشد
۵۔ فیض احمد فیض۔عکس اور جہتیں از مرتبہ شاہد ماہلی
۶۔ فیض احمد فیض۔تنقیدی جائزہ از مرتب خلیق انجم
۷۔ فیض احمد فیض۔شخص اور شاعری از مرتبہ اطہر نبی
۸۔ www.rekhta.org

❑❑❑

Dr. IRFANA BEGUM,
Associate Professor & Head Dept of Urdu,
KVR Govt. College for women Autonomous Kurnool, Andhra Pradesh
Mail ID: irfanabegum@kvrgdcwa.ac.in
Cell No: 9966458939

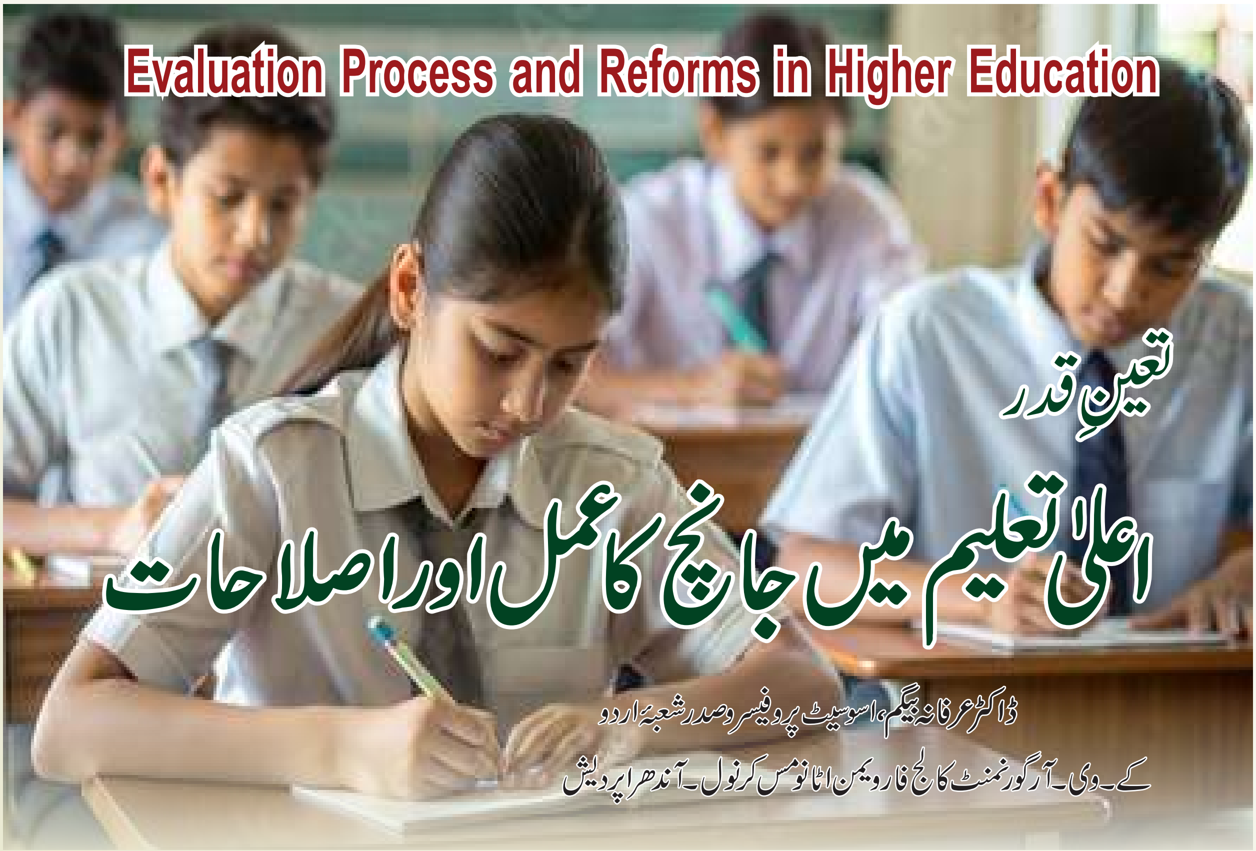

Evaluation Process and Reforms in Higher Education

تعینِ قدر

اعلیٰ تعلیم میں جانچ کا عمل اور اصلاحات

ڈاکٹر عرفانہ بیگم، اسوسیٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو
کے۔وی۔آر گورنمنٹ کالج فارویمن اٹانومس کرنول۔آندھرا پردیش

انسان کی زندگی میں نئے نئے علوم و تجربات اس کے طرزِ عمل میں خاطر خواہ تبدیلی لاتے ہیں۔انسان رسمی اور غیر رسمی طور پر علم سیکھتا ہے اور زندگی میں ان کا اطلاق کرتا ہے یعنی تعلیم ایک تا عمر چلنے والا امر ہے۔اس طرح وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے۔لیکن ہدف اور مقاصد کے حصول کی صحیح جانکاری کے لئے مختلف قسم کی جانچ کے طریقہ کار پیمائشی آلات اس میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

تعلیم کے حصول میں تین اجزاء خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔پہلا مقاصد کا تعین دوسرا مقاصد کا حصول اور تیسرا مقاصد کے حصول کی مقدار کو متعین کرنے کے لئے جانچ یا تعینِ قدر۔

حصول علم کے دورانِ معلم کے بنیادی فرائض میں ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وقتاً فوقتاً طالبِ علموں کی لیاقت وصلاحیت کی جانچ کرے اور ان کی رفتار و ترقی کا جائزہ لے۔اس سے معلم کو اپنے طریقۂ تدریس، نظام الاوقات اور علمی صلاحیتوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔اس کے ساتھ طلباء کی لیاقت اور صلاحیت کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔اس کے ذریعہ طلباء اور معلم دونوں کی محنت کو ترغیب اور مابعد کام کے اعادہ اور جانچ کا برابر موقع ملتا رہتا ہے۔جانچ یا تعینِ قدر موجودہ نظامِ تعلیم میں طلباء، معلمین اور والدین سب کے لئے یکساں طور پر اہمیت کا حامل ہے۔

جانچ کے بارے میں مختلف ماہرین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

تعلیمی کمیشن کے مطابق؛ ''تعینِ قدر ایک مسلسل عمل ہے۔یہ مکمل نظامِ تعلیم کا ایک اہم عنصر ہے اور مقاصدِ تعلیم سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔
یہ طلباء کے مطالعہ کی عادت اور طریقۂ تدریس پر کافی اثر ڈالتا ہے اور اس طرح یہ تعلیمی تحصیل کی پیمائش اور اس میں بہتری لانے میں معاون ہوتا ہے''۔

گرین کے مطابق؛ ''تعلیم میں تعینِ قدر کا استعمال مدرسہ کے پروگرام، نصاب، آلات و وسائل، معلم اور متعلم کو جانچنے کے لئے کیا جاتا ہے''۔

آرسی شرما کے الفاظ میں؛ ''جانچ ایک مسلسل اور جامع عمل ہے۔یہ مدرسہ اور اس کے باہر انجام پاتا ہے۔اس عمل میں طلباء، معلم، والدین اور کمیونٹی شریک

ہوتے ہیں تا کہ طالبِ علم میں اور پورے تعلیمی نظام میں تبدیلی لائی جاسکے“۔
مجموعی طور پر جانچ کو پہلے سے طے شدہ تعلیمی مقاصد کے حصول، کمرۂ جماعت میں مہیا شدہ تدریسی و اکتسابی آلات و تجربات کے موثر طرزِ عمل کی نشو ونما کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

جانچ کی اہمیت وضرورت: حصولِ تعلیم کے دوران پیائش و جانچ سے گریز ناممکن ہے۔اس کی اہمیت سے انکار کرنا دراصل حقیقت سے روپوشی ہے۔تعلیمی اداروں کی اساس دراصل پیائش، جانچ اور تعینِ قدر پر ہی منحصر ہے۔ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں ترقی کے لئے امتحان یا جانچ ضروری ہے۔کسی معلم کے طریقۂ تدریس کی کامیابی اور ناکامی اس کی تدریسی لیاقت وقابلیت کا پتہ جانچ کے ذریعہ ہی لگایا جاتا ہے۔نصاب کی کتابوں کا صحیح انتخاب اور طلباء میں مطالعہ کا ذوق، امتحان یا جانچ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ پیائش یا جانچ قومی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہے۔صرف کمرۂ جماعت ہی نہیں بلکہ حقیقی زندگی میں بھی جانچ کی بڑی اہمیت ہے۔ہم اپنی زندگی میں مختلف قسم کے فیصلے لیتے ہیں اور موقع بموقع اس کی جانچ بھی کرتے ہیں کہ وہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط اور یہ ہی جانچ آگے کی زندگی کے لائحہ عمل کو متعین کرتی ہے۔جانچ کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر مقاصد میں ترمیم بھی کی جاسکتی ہے۔

جانچ یا تعینِ قدر کی اہمیت کو درج ذیل نکات سے اور بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں۔

۱۔ کمرۂ جماعت کی تدریس کے مقاصد جانچ سے ہی پورے ہوسکتے ہیں۔
۲۔ جانچ کے ذریعہ طلباء کی انفرادی اور گروہی مشاورت کی استعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
۳۔ طریقۂ تدریس طلباء، مضامین اور مناسب تبدیلیوں کی گنجائش کا امکان جانچ سے ہی ممکن ہے۔
۴۔ طلباء کی ضرورت، دلچسپی، رویہ اور استعداد کی بنیاد پر نصاب میں ترمیم وتبدیلی جانچ کی بنیاد پر ممکن ہے۔
۵۔ جانچ مطالعہ کے لئے تحریک دیتی ہے۔جانچ میں کچھ ایسے سوالات ہوتے ہیں جو کہ پورے نصاب پر مبنی ہوتے ہیں جس سے طلباء کے علم وتفہیم میں اضافہ ہوتا ہے۔جانچ ایک طریقہ سے معلم اور متعلم دونوں کیلئے تقویت کا کام کرتی ہے۔
۶۔ جانچ کے ذریعہ طلباء کی اکتسابی دشواریوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
۷۔ جانچ کے ذریعہ طلباء کو تعلیمی ماحول سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے طلباء کے مضبوط اور کمزور علاقوں کی نشاندہی ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں معلم اور ادارہ ان کمزوریوں کو دور کرنے کیلئے لائحہ عمل تیار کرکے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

معیاری جانچ کی خصوصیات:

☆ انسانی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی جانچ کرنے کے لئے ماہرینِ تعلیم نے مختلف آلات اور ٹکنیک کی تعمیر وتشکیل کی ہے۔ان میں مشاہداتی طریقۂ کار، انٹرویو، سوالنامہ، معلم کے ذریعہ تیار کردہ غیر رسمی ٹیسٹ، معیاری ٹیسٹ، ریٹنگ اسکیل، انیکڈوٹل ریکارڈ، مجموعی ریکارڈ اور سوشیومیٹر بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

☆ ایک معیاری جانچ کو ایک مثالی طریقہ پر درست، معتبر، قابلِ عمل، منصفانہ اور مفید ہونا چاہئے۔

☆ مقاصد سے مراد معلم کی وہ توقعات ہیں جس سے وہ طلباء کے طرزِ عمل میں مطلوبہ تبدیلی لانا چاہتا ہے۔

☆ جانچ (Evaluation) کے تحت نہ صرف شخصیت کے مادی پہلوؤں بلکہ کیفیتی پہلوؤ ں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جاتی ہیں علاوہ ازیں اس کے ذریعہ جسمانی نشو ونما، سماجی نشو ونما اور اخلاقی نشو ونما کی بھی جانچ کی جاسکتی ہے۔

☆ جانچ(Evaluation) کے ذریعہ طلباء کی دلچسپیوں، تصورات، تفکرات، عادتوں میں بھی تبدیلی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

☆ جانچ کا تصور زیادہ جامع اور وسیع ہے اور دیگر تصورات جیسے آزمائش، امتحان، پیمائش اور اندازہ قدر اس کے جزو ہیں۔

☆ پیمائش (Measurement) کا دائرہ محض کمیتی (Quantitative) پہلو تک محدود رہتا ہے جب کہ جانچ (Evaluation) کے اندر کیفیتی (Qualitative) دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔

☆ مسلسل اور جامع جانچ سے مراد معلم کے جماعت میں داخل ہونے سے لے کر سبق کے اختتام اور کورس یا پروگرام کے اختتام تک اکتساب کے حصول کی جانچ کرنا ہے۔

☆ مسلسل اور جامع جانچ کے ذریعہ طلباء کے نہ صرف وقوفی اور معلوماتی پہلوؤں کا بلکہ سماجی، اخلاقی، جذباتی، جمالیاتی غرض ہر پہلو کو جانچا و پرکھا جاسکتا ہے۔

☆ جانچ میں درسیات کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی ہو، علم، تفہیم اور حافظہ کی جانچ ہی معروضی جانچ کی خوبیاں مانی جاتی ہیں۔

موجودہ امتحانی نظام کے نقائص اور اصلاحات: آزادی کے حصول کے کئی دہائیوں بعد بھی ہمارے امتحانی نظام میں خاطر خواہ اصلاح نہیں ہو پائی ہے اور اس میں اب بھی بے شمار خامیاں پائی جاتی ہیں۔

مختلف ماہرینِ تعلیم اور منتظمین بہت تلخ اور راست انداز میں موجودہ امتحانی نظام کے لئے مختلف لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کہ یہ ایک ضروری برائی ہے، بڑھتی ہوئی مصیبت ہے، خون چوسنے والا عمل ہے، تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ہے، جہالت کی آزمائش ہے وغیرہ وغیرہ۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ''یہ ہندوستانی تعلیم کا بدترین پہلو ہے''۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستانی تعلیمی نظام کے تعلق سے اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ

''ہمارے ملک میں رائج نظامِ امتحان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تعلیم کیلئے بددعا ہے''۔

موجودہ امتحانی نظام کے اہم نکات اور اس کے اصلاحات درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ روایتی امتحانات، نصاب اور طریقۂ تدریس دونوں پر اپنی فوقیت رکھتے ہیں۔ عام طور پر معلمین کا سارا زور امتحان میں بہتر نتائج لانے پر ہی ہوتا ہے۔ معلمین بچوں کو ایسے سوالات کے جوابات رٹا دیتے ہیں جو امتحان میں متوقع ہوتے ہیں۔ وہ محض امتحان کے نقطۂ نظر سے ہی اپنی تدریس کرتے ہیں۔ اس عمل سے طلباء میں انفرادی سوچ، تخلیقی رجحان اور تصورات وحقائق کو سمجھنے اور اطلاق کرنے کی صلاحیتیں فروغ نہیں پاتیں۔ دورِ حاضر میں مختلف گائیڈس، ماڈل پیپرس، Guess پیپرس کی مدد لینا، سوالات کے پرچے آؤٹ کرنا، امتحان ہال میں نقل نویسی کرنا جیسی بیسوں بُرائیاں اسی امتحانی نظام کا نتیجہ ہیں۔

۲۔ ہمارے امتحانات غیر معقول ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں صرف یاد کرنے کے عمل کی ہی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور تفہیم واطلاق پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا ہے۔

۳۔ موجودہ تعلیمی نظام مکمل تعلیمی پہلوؤں کے صرف چند پہلوؤں کا ہی احاطہ کرتا ہے اور دوسرے اہم پہلو جیسے ذہانت، دلچسپی، رویئے، مہارتیں اور شخصیت کے دیگر اوصاف جیسے جسمانی نشوونما اور سماجی نشوونما جیسے اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

۴۔ چونکہ زیادہ تر امتحانات تحریری ہوتے ہیں اس میں صرف لکھنے کی صلاحیت کی ہی جانچ بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔ سُننا، بولنا اور پڑھنا کی مہارتوں کی جانچ نہیں ہو پاتی۔ اس خامی کو دور کرنے کے لئے زبانی امتحان بھی رکھنا ضروری ہے۔

۵۔ امتحان طلباء کی اخلاقی معیار میں گراوٹ کے بجا طور پر ذمہ دار ہیں۔ Raging، ڈسپلن شکنی، نقل نویسی، جونیر طلباء و ممتحن کو ڈرانا دھمکانا اور دوسری غیر قانونی حرکتیں کرنا، اور غیر سماجی برتاؤ اختیار کرنا اس کی مثالیں ہیں۔ ناقص امتحانی نظام کے نتیجہ میں ہی ہڑتالیں، دھرنے، پیپر آؤٹ جیسے واقعات

رونما ہوتے ہیں۔

٦۔ امتحانات سے طلباء پر نفسیاتی اثرات پڑتے ہیں۔ کئی طلباء امتحان کے خوف کا شکار ہوتے ہیں اور اس صورتحال کے لئے موجودہ دور میں ایک اصطلاح امتحان فوبیا رائج ہے۔ امتحانی بخار، ذہنی اعصابی تناؤ کی وجہ سے راتوں کو نیند نہ آنا، تفکرات، حسد، حوصلہ شکنی طلباء میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ امتحان کا طلباء پر کس حد تک نفسیاتی اثر پایا جاتا ہے اس کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پبلک امتحانوں اور مسابقتی امتحانات کے نتیجے نکلنے کے ساتھ ہی اخبارات میں امتحان میں ناکامی کی بناء پر طلباء کی خودکشی کی اطلاعات آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ امتحان کے منفی پہلوؤں کی بدترین مثال ہے اس کی روک تھام وقت کی اولین ضرورت ہے۔

٧۔ اکثر والدین یہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے امتحان میں کامیابی حاصل کرنا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو سوائے پڑھنے لکھنے کے کوئی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ ان کے پاس تعلیم کی پیمائش کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے امتحان کے نتائج۔ اس طرح کے رویوں اور تصورات کی وجہ سے طلباء کی ہمہ جہت نشو و نما پر بُرا اثر پڑھتا ہے۔

غرض اعلیٰ تعلیمی سطح پر امتحانی نظام کو ان خامیوں سے پاک رکھنے کی پُر خلوص کوششیں کی جانی چاہئے۔ طلباء کے والدین، اساتذہ، منتظمین، اعلیٰ عہدے دارانِ تعلیم، روزگار مہیا کرنے والی کمپنیاں ہر ایک کے لئے ضروری ہیکہ وہ اس جانب سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کریں اور فکر و ذہن میں مثبت تبدیلی لائیں اور یہ یقین کر لیں کہ محض امتحانات میں اچھے نمبرات سے کامیابی ہی طالبِ علم کا نصب العین نہیں ہے اور نہ مستقبل میں کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

ا۔ طریقۂ تدریس اردو از سید جلیل الدین

٢۔ www.rekhta.com

Dr. IRFANA BEGUM,

Associate Professor & Head Dept. of Urdu

KVR Govt College for women Autonomous Kurnool

Cell No: 9966458939 Mail Id: irfanabegum@kvrgdcwa.ac.in

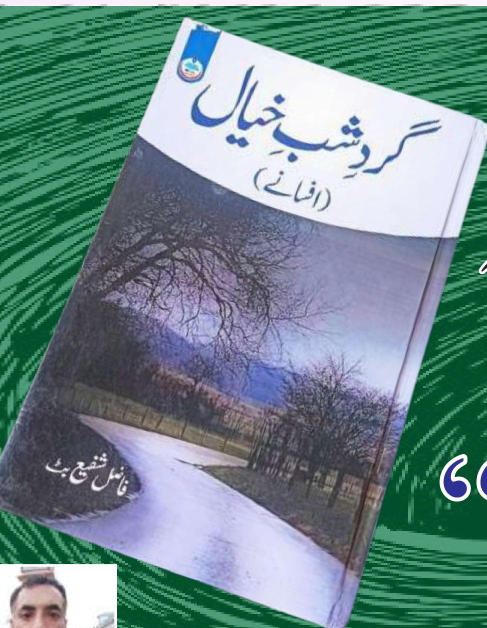

فاضل شفیع بٹ کا افسانوی مجموعہ

''گردِشبِ خیال''

رئیس احمد کمار

جنوبی کشمیر کے اکنگام گاؤں سے تعلق رکھنے والے فاضل شفیع بٹ قلیل مدت میں ہی ادبی دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے کالم، تبصرے اور خاص کر افسانے ادبی حلقوں میں مسلسل پزیرائی حاصل کر رہے ہیں جو ریاست، ملک اور بیرون ملکوں کے متعدد روزناموں، رسالوں اور جریدوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گردشب خیال'' منظر عام پر آیا ہے جو فکشن رائٹرز گلڈ کی ایک خصوصی نشت کے دوران ریلیز ہوا ہے۔ اب تک اس مجموعہ پر بہت سے ادیبوں اور لکھاریوں نے اپنے تبصرے تحریر کئے ہیں جو ناموں روزناموں اور رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مجموعہ 158 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل پچیس افسانے شامل ہیں۔ اس کا سرورق دیدہ زیب ہے اور مشہور پبلشر جی این کے پبلیکیشنز کے ذریعے اسے شائع کروایا گیا ہے۔ فاضل شفیع نے اس مجوعہ کو اپنے مرحوم والد، والدہ، شریک حیات، اپنی لخت جگر اور رہبر و استاد معراج زرگر صاحب کے نام کیا ہے۔

مجموعہ کا پیش لفظ خود قلمبند کرتے ہوئے فاضل شفیع بٹ کا ماننا ہے کہ اردو ادب سے محبت ان کا پہلا عشق تھا اور بھارتی بحریہ سے سبکدوش ہوتے ہی انہوں نے مضامین اور افسانے قلمبند کرنے شروع کر دیئے۔ مزید ان کا کہنا ہے کہ اس افسانوی مجموعے کا عنوان معراج زرگر صاحب نے تجویز کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ان کے استاد اور رہبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

معراج زرگر صاحب اس کتاب پر تبصراتی تحریر قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''فاضل شفیع کی تحریروں میں ایک سادگی اور اپنے ماحول، اپنے لوگوں اور اپنے سماج میں پیش آئے واقعات کی برملا عکاسی ہوتی ہے۔''

نسیم اشق (جن کا تعلق کولکتہ مغربی بنگال سے ہے) نے بھی اس مجموعہ پر اپنے مختصر مگر جامع تاثرات تحریر کئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فاضل شفیع نے زندگی کا جو مشاہدہ کیا ہے ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے، زندگی کے ان مسائل کے تلخ تجربات کے نقوش بدرجہ اتم ملتے ہیں۔ ''ٹریلر'' یہ افسانہ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ہے جس میں فاضل انسانی فطرت کے کئی پہلوں کو دکھانے کی کامیاب کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ افسانے کے ذریعے ایک منفرد اور خوبصورت انداز میں دکھایا گیا ہے کہ انسان کس طرح دنیاوی زندگی کو ہر

وقت ترجیح دے کر اپنے رب کو بھول کر اپنی آخرت کو برباد کرتا ہے۔ رشوت خوری، چوری، دھوکہ دہی اور بے ایمانی آج کے مسلمانوں میں گویا ہر وقت ساتھ رہتی ہے اور اپنے مفادات کے خاطر انہی کا سہارا لے کر زندگی کے ایام گزارتا ہے اور قانون قدرت کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ ''کفران نعمت'' اس افسانوی مجموعہ کے چند بہترین افسانوں میں یہ ایک ہے۔ آج کے سائنس و ٹیکنالوجی کے دور میں جہاں انسانی زندگی پہلے کے مقابلے میں کافی آسان اور آرام دہ بن چکی ہے وہیں انسانی قدریں پامال ہوتی جارہی ہیں اور اخلاقیات کا جنازہ نکل کر ہم سب کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ شادی کے بعد بہت سے جوڑے اولاد کی نعمت سے محروم ہی رہتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ایک ہی اولاد ہوتی ہے۔ اپنے گھروں اور سماج میں انہیں کس طرح ستایا جاتا ہے الفاظ میں بیان کرنا محال ہے۔ ایسے ہی ایک جوڑے کی کہانی کو افسانوی رنگ دے کر افسانہ نگار نے دلکش انداز میں بیٹی کی شفقت اور محبت کو الفاظ میں بیان کیا ہے جسے پڑھ کر قاری اتفاق کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بیٹی بھی ایک بیٹے کی طرح ہوتی ہے اور اگر اسے بھی پیار و محبت اور شفقت سے پالا پوسا جائے اور اچھی تربیت دی جائے تو وہ دن دور نہیں جب وہ بھی اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کرے گی اور والدین کی ہر وقت فرمانبرداری اور خدمت کرتی رہے گی۔ ''شب خون'' اس افسانے میں مصنف نے ایک اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ یتیم اور لاچار لوگوں کے مال اور اراضی کو کس طرح آج کے نام نہاد مسلمان ہڑپ کر کے مساجد اور عیدگاہ جیسے عبادت گاہیں تعمیر کرواتے ہیں، ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔ ہمارے قانون دان بھی حق کا ساتھ دینے کے بجائے پیسوں کے عوض کس طرح بک جاتے ہیں اس کہانی میں خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ''گند کے کیڑے''، فاضل شفیع نے افسانوی رنگ دے کر ایک منفرد کہانی کے ذریعے درندا اور شیطان صفت انسانی روپ رکھنے والے سماج دشمن عناصر کے کار کرتوت کو بہتر انداز میں بیان کیا ہے جو ایک گدھ کی طرح ہمیشہ حرام کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ اتنے اندھے بن جاتے ہیں کہ حلال اور حرام کی تمیز کرنا کھو دیتے ہیں۔ اس کہانی سے یہ باور کرایا گیا ہے کہ مکافات عمل کے ذریعے ماضی میں کئے ہوئے غلط اور ناجائز فعل مستقبل میں کس طرح شرمندہ کر دیتے ہیں اور پھر پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے۔ ''رہائی'' شاعروں اور نثر نگاروں نے بند پرندوں کی روداد مختلف انداز میں بیان کی ہے۔ مختلف زبانوں میں پرندوں کی آزادی اور پنجرے میں بند پرندوں کی اس آزادی کو چھیننا کس قدر ملامت کی نگاہ سے دیکھا اور بیان کیا گیا ہے ہمارا اردو ادب تحریرات سے بھرا ہوا ہے۔ فاضل شفیع نے بھی ایسی ہی ایک خوبصورت تخلیق لکھ ڈالی ہے جس میں ایک چھوٹی ننھی سی پری اپنے باپ کو ایک خوبصورت پرندہ خریدنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسے پرندے کی آزادی کا بالکل بھی خیال نہیں رہتا ہے بلکہ جب ایک پرندے کو آزاد چھوڑا جاتا ہے تو اس کا دل مغموم ہو جاتا ہے۔ خواب شہر، دیہات میں سہولت وغیرہ نہ ہونے کی بنا پر اکثر صاحب ثروت لوگ شہروں اور قصبوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ پکی سڑکیں، جدید طرز کے تعلیمی ادارے اور ہسپتال وغیرہ کی سہولیات عام لوگوں کو بھی راغب کرتی ہیں۔ حالانکہ دیہاتوں کا پرسکون ماحول، صاف و شفاف پانی کے زخائر اور سیدھے سادھے لوگ شہروں اور قصبوں میں نہیں ملتے ہیں بلکہ لوگوں کی اچھی خاصی تعداد گاؤں کی زندگی کو ہی ترجیح دیتے ہیں اور اپنی مٹی اور اپنے آبائی وطنوں سے پیار اور دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ اسی موضوع پر فاضل نے بھی ایک بیانیہ تحریر لکھی ہے جس میں ایک گاؤں کا مکین اپنی ساری جائداد بیچ کر شہر میں رہنا چاہتا ہے۔

فاضل شفیع بٹ کی کہانیاں عام فہم اور سادہ الفاظ میں بیان ہوئی ہیں تاکہ قاری کو بنیادی موضوع اور پیغام سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ ہو۔ الفاظ کی روانی اور ان کا مناسب استعمال فاضل کے افسانوں کو ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے اور قاری ایسی تخلیقات پڑھنا بے حد پسند کرتا ہے۔

❑❑❑

رئیس احمد کمار
قاضی گنڈ کشمیر

عاجزؔ اورنگ آبادی کے کلام میں

صنعتِ لفّ ونشر

اسلم مرزا

ولیؔ اورنگ آبادی کے فوراً بعد اورنگ آباد خجستہ بنیاد کے ادبی منظر نامے پر طلوع ہونے والے شعرا میں جس طرح شاہ سراجؔ اورنگ آبادی کا اسم گرامی سب سے نمایاں، روشن اور تابناک ہے اسی طرح داؤدؔ اورنگ آبادی، شفیقؔ اورنگ آبادی، شاہ فضلیؔ اورنگ آبادی، محمد شریف مفتونؔ اورنگ آبادی، شاہ قاسم اورنگ آبادی، شاہ سامیؔ اورنگ آبادی اور افتخارؔ دولت آبادی وغیرہ بھی قابل توجہ رہے ہیں۔ انہی شعرا کی فہرست میں ہمیں اس عہد کے ایک اہم شاعر عارف الدین خان عاجزؔ بلخی ثم اورنگ آبادی کے شعری محاسن اور کمالات کا بھی تعارف ہوتا ہے۔

میرزا افضل بیگ خان قاقشال کے مطابق عارف الدین خاں عاجزؔ کم عمری سے ہی شعر گوئی کی جانب راغب ہوئے۔ مزاج میں ظرافت اور شوخی تھی۔ قدرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا اس لیے فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے کرتے عمدہ شعر کہنے لگے تھے۔ عاجزؔ کو زبان و بیان پر غضب کی قدرت تھی۔ اکثر سنگلاخ زمینوں اور مشکل مضامین سے اپنی شعری کائنات کو سجاتے تھے۔ میر تقی میرؔ نے ''نکات الشعراء'' میں ذکر کیا ہے کہ وہ ''اکثر نامربوط یا مشکل قافیوں کو بہت خوبی کے ساتھ موزوں کر دیتے ہیں۔'' لچھمی نرائن شفیقؔ اورنگ آبادی نے اپنے تذکرہ ''چمنستان شعراء'' میں انھیں ''سخنوری کے پہلوان، معنی پروری کے رستم، شیریں مقال، رنگین خیال اور صاحبِ قدرت معانی آفریں'' کے القاب سے نوازا ہے۔ ''تذکرۂ حسنی'' میں فتوتؔ اورنگ آبادی نے عاجزؔ کو ''اورنگ نشینِ اقلیم معانی، زیب افزائے ممالک سخن دانی، مرجعِ سخن گویان حقیقی فہم، رافعِ علم فکرِ رسا اور طبعانِ باچشم'' جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

عاجزؔ نے غزلوں کے علاوہ کبت، ثلاثی، جھولنے، رباعیاں، مستزاد وغیرہ بھی کہے۔ شفیقؔ نے عاجزؔ کا دیوان ریختہ دیکھا تھا اور لکھا ہے کہ اس میں ایک ہزار سے کچھ زیادہ اشعار ہوں گے۔ تذکرہ ''گلشنِ گفتار'' میں حمیدؔ اورنگ آبادی نے لکھا ہے کہ انھوں نے عاجزؔ کا دیوان ریختہ اور فارسی دونوں ترتیب دیے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد کے کتب خانے میں ۱۱۷۸ھ سے قبل تحریر کردہ ''دیوانِ عاجزؔ'' کا قلمی نسخہ محفوظ ہے لیکن نامکمل ہے۔ تاہم اس میں پانچ سو اشعار ہیں۔ مشفقؔ خواجہ نے ''جائزہ مخطوطات اردو'' میں اطلاع دی ہے کہ عاجزؔ کا دیوان ۱۱۶۵ ہجری سے قبل مرتب ہو چکا تھا۔ ''دیوانِ عاجزؔ'' کا ایک نسخہ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد میں اور ایک نسخہ ببلوٹیک ناسیونال (پیرس) میں بھی موجود ہے۔ عاجزؔ کو تاریخ گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ تھا اور اپنے عہد میں ''مورخِ بے بدل'' کے نام سے ان کی شہرت تھی۔ ان کی مثنوی ''لعل و گوہر'' بھی مشہور ہے۔ ۱۱۷۸ ہجری (مطابق عیسوی ۱۷۶۵) میں عاجزؔ کا انتقال ہوا۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے عمدہ شاعری کی تین خصوصیات جیسے تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ کو لازمی قرار دیا تھا۔ ان معیارات پر بھی عاجزؔ کا کلام ہمیں مایوس نہیں کرتا۔ وہ اپنے کلام کی پختگی، معنی آفرینی، جمالیاتی اقدار، اسلوب کے تنوع اور زبان کی صفائی کی وجہ سے اپنے دور کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ مشکل قوافی اور سنگلاخ زمینوں میں شعر کو سجا سنوار کر پیش کرنے میں انھیں ملکہ تھا۔ یہاں نموناً عاجزؔ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

دل کا چمن میرا جب سیں جلایا تیرے شرارِ جفا نے اے سرکش
دم بدم آہوں کے شمعوں کے نخلوں سیں جھڑتے ہیں گل جیسے شعلۂ آتش

بہار آنے سیں شبنم نے کیا ہے گل کا بستر تر
چمن میں چل کر اس کوں فرش کر خورشید پیکر تر

بڑا پگڑ ، بڑا شملہ ، بڑا کلہ ، بڑا داڑھا
بڑھایا ہے بڑی محنت سے زاہد نے وقار اپنا

دیکھ دامن گیر محشر میں ترے ہوئیں گے ہم
خوں ہمارا اپنے دامن سے نہ اے قاتل چھڑا

محبت کے چمن کا گل جو بویا ہے یہی دل ہے
بہار عشق کا بلبل جو گویا ہے یہی دل ہے

گر اس خورشیدرو کی فکر مہمانی کروں عاجزؔ
ستاروں کے بڑے کوں توڑ بیلوں چاند کا مانڈا

جب سے اے رنگیں ادا تیرا ہے رنگ گل میں نقش
تب سے میری آہ کا ہے سینۂ بلبل میں نقش

تجھ مکھ کوں دیکھ چاند گگن سیں گیا اکھڑ
تجھ قد کوں دیکھ سرو چمن سیں گیا اکھڑ

دل ہمارا گوہرِ غلطانِ بحرِ عشق ہے
دم ہمارا شورش طوفانِ بحرِ عشق ہے

اشک نے گرداب باندھا ہے ہمارے آس پاس
کیوں کہ نکلا جائے یہ زندانِ بحرِ عشق ہے

اگر کیف سخن میرا نہاں ہو تاک کو پہنچے
صراحی شاخ ہوجائے شراب انگور سیں ٹپکے

عاجزؔ اورنگ آبادی کی یہ غزل جس کا مطلع ہے ۔

چمن میں چل کے سجن بے حجاب ساغر کھینچ
بہارِ رنگِ گلستاں کے سرسیں چادر کھینچ

اس کے سو سال بعد مرزا غالبؔ کے زمانے تک یہ زمین رائج رہی۔ غالبؔ نے بھی اس زمین میں غزل کہی ہے، جس کا مشہور مطلع یہ ہے ۔

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

’’صنعتِ لف ونشر‘‘ میں بھی ہمیں عاجزؔ اورنگ آبادی کی ایک مرصع ، بلیغ اور پُرشکوہ غزل ملتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عاجزؔ اپنی شاعری میں علم بدیع کی پاسداری کے ساتھ کلام میں فصاحت اور بلاغت کا التزام رکھتے تھے۔

علم بدیع کی وضاحت کرتے ہوئے نجم الغنی رامپوری نے ’’بحر الفصاحت‘‘ میں لکھا ہے کہ علم بدیع وہ ہے جس سے کلامِ بلیغ کی عارضی خوبیوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ کلام میں جو الفاظ منتخب کیے جائیں ان میں قوتِ ترسیل کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی علم بدیع سے کلام کی آرائش وزیبائش کی جاتی ہے جس میں صنائع معنوی اور صنائع لفظی کا التزام ہوتا ہے۔ ’صنائع‘ جمع ہے صناعت کی۔ یعنی ایسی چیز جو ہنرمندی اور مہارت کے ساتھ بنائی گئی ہو۔ صناع صفت ہے اور اس کا مادہ ص ن ع ہے یعنی بنانا۔ بدائع جمع ہے بدیع کی، یعنی کوئی نئی، تازہ، اچھوتی اور نادر چیز کے۔ بدع کا مادہ ب د ع ہے یعنی ایجاد کرنا۔

صنائع لفظی سے لفظی خوبیوں کا اور صنائع معنوی سے علم ہوتا ہے کہ شعر میں کون سی نئی چیز ایجاد کی گئی۔ یہ صنعتیں جب کلام میں اتفاقیہ طور پر آجائیں تو شعر میں لطف پیدا ہوتا ہے۔ شروع میں صنائع معنوی کی صرف سترہ اقسام کی نشاندہی کی گئی تھی لیکن اب ترقی کرتے کرتے ان کی تعداد ایک سو سترہ سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ صنعتِ معنوی میں تضاد ، ایہام ، ایہامِ تناسب ، تذبیح ، مقابلہ، سوال و جواب ، مبالغہ، جمع وتفریق ، مراعات النظیر ،

حسنِ تعلیل، تجاہلِ عارفانہ، تجرید، لف ونشر، اطراد، عکس وتبدیل وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

چونکہ میری گفتگو عاؔجز اورنگ آبادی کے کلام میں صنعتِ لف ونشر سے متعلق ہے اس لیے یہاں صنعتِ لفّ ونشر کا سرسری جائزہ ہماری معلومات کے لیے ضروری ہے جسے صنائع معنوی کی ایک قسم بتایا گیا ہے۔

'لفّ' کے معنی ہیں 'لپیٹنا' اور 'نشر' کے معنی ہیں 'کھولنا'۔ اس صنعت میں شاعر پہلے چند چیزوں کا ذکر کرتا ہے اور پھر آگے ان چیزوں کی مناسبات کو بیان کرتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق لفّ ونشر کے معنی پراگندہ اور منتشر چیزوں کو لپیٹنا۔ علم بیان کی اصطلاح میں وہ صنعت کہ جس میں اول چند چیزوں کا مفصل یا مجمل ذکر کریں اور پھر اُس کے بعد چند اور چیزیں بیان کریں جو پہلی چیزوں سے نسبت رکھتی ہوں مگر اِس طرح کہ ہر ایک کی نسبت اپنے منصوبہ الیہ سے مل جائے۔ علمائے ادب نے صنعتِ لفّ ونشر کی تین اقسام بتائی ہیں :

(۱) صنعت لفّ ونشر مرتب : اس میں شعر کے مصرع اولیٰ میں شاعر جن چیزوں کا ذکر کرتا ہے اسی ترتیب سے مصرع ثانی میں مناسبات کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً کسی شاعر کا شعر ہے۔

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشقِ زار
گل جدا ، سرو جدا ، نرگسِ بیمار جدا

یہاں مصرع اولیٰ میں تین چیزیں یعنی رخسار، قد اور چشم کا بیان ہے۔ اب ان تینوں کی مناسبت سے مصرعِ ثانی میں گل، سرو اور نرگس آئے ہیں۔ یعنی رخسار کی مناسبت سے گل، قد کی مناسبت سے سرو اور چشم کی مناسبت سے نرگس۔

صنعت لفّ ونشر مرتب میں میر انیؔس کا یہ شعر بھی پیش کیا جاتا ہے۔

چھپتی تھیں ، بھاگی جاتیں تھیں ، گرتے تھے خاک پر
قبضوں سے تیغیں ، جسم سے روحیں ، تنوں سے سر

یعنی قبضوں سے تیغیں چھپتی تھیں، جسم سے روحیں بھاگتی تھیں اور تنوں سے سر خاک پر گرتے تھے۔

فرہنگ آصفیہ میں نصیر دہلوی کا یہ شعر حوالے کے طور پر ملتا ہے۔

دوپٹہ سر پر ہے بادلے کا گلاب پاش اس کے ہاتھ میں ہے
نہ کیوں کہ چمکے نہ کیوں کہ برسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

ایک اور شعر فرہنگ آصفیہ میں ملتا ہے۔

لب و چشم کو جس کا بیمار دیکھا
کئی بار پوچھا کئی بار دیکھا

یہاں لب کے موافق پوچھنا اور چشم کے موافق دیکھنا علی الترتیب لکھا ہے۔

(۲) صنعت لف ونشر غیر مرتب : محولہ دو اشعار (صنعت لف ونشر مرتب) میں ہمیں ایک خصوصیت دکھائی دی ہے کہ مصرع اولیٰ میں جن اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے اسی ترتیب سے مصرعِ ثانی میں ان اشیاء کی مناسبات کو بیان کیا گیا ہے لیکن اگر یہ ترتیب بدل جائے تو یہ لف ونشر غیر مرتب ہے۔ اس کی مثال میں یہ شعر دیکھیے۔

رخ و جبیں و مژہ تیر و چشم و ابرو کو
سنان و بدر و مہ و نرگس و ہلال لکھا

اس شعر میں رخ کی مناسبت سے مہ (ماہ) جبیں کی مناسبت سے بدر، مژہ کی مناسبت سے سناں، چشم کی مناسبت سے نرگس اور ابرو کی مناسبت سے ہلال کو رکھا ہے۔ آخری دو چیزیں تو ترتیب میں ہیں لیکن ابتداء کی تین چیزیں اس ترتیب سے موجود نہیں ہیں۔

لف ونشر غیر مرتب میں مرزا غالبؔ کے مندرجہ ذیل شعر کا بھی حوالہ ملتا ہے۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

اس شعر میں ترتیب نہیں ہے۔ دل کی مناسبت سے خیال کو بعد میں اور دیدہ کی مناسبت سے نظارہ کو پہلے پیش کیا ہے۔

منشی سید غلام حسین قدؔر کا شعر۔

روئے پیٹے میرے ماتم میں وہ اتنا اے قدؔر
ہاتھ کی مہندی چھٹی آنکھ کا سرمہ چھوٹا

یعنی رونے سے آنکھوں کا سرمہ بہا اور پیٹنے سے ہاتھوں کی مہندی چھوٹی۔ اگر مصرع ثانی میں پہلے سرمہ اور بعد میں مہندی کا لفظ آجاتا تو یہی لفّ ونشر مرتب ہوجاتا۔

(۳) صنعت لف ونشر معکوس الترتیب : حوالے کے طور پر میر انیؔس کا یہ

مصرع پیش کیا جاتا ہے ع

واللیل والضحیٰ رخ روشن خطِ سیاہ

اس میں واللیل کے بعد والضحیٰ آیا ہے جبکہ مناسبت کی ترکیب معکوس ہے۔ پہلے روشن ہے اور بعد میں خطِ سیاہ۔ اس میں مناسبات کی وہ ترتیب نہیں ہے جو مصرع کے شروع میں بیان کی گئی ہے بلکہ اس کے برعکس لکھا ہے۔

میرے زیرِتحریر مضمون کے عنوان کے پیشِ نظر یہاں عارف الدین خاں عاجزؔ اورنگ آبادی کی ایک غزل کے پانچ اشعار پیش کرتا ہوں جو صنعت لف ونشر مرتب کا بہترین نمونہ ہیں۔ اب تک علمائے ادب نے عاجزؔ اورنگ آبادی کی اس مرصع غزل کو صنعت لف ونشر مرتب میں حوالے کے طور پر پیش نہیں کیا ہے۔ اس بحرِطویل کی غزل میں کلام کی پختگی، اسلوب کا تنوع، زبان کی صفائی، فصاحت اور بلاغت ''دامنِ دل می کشد'' کی عمدہ مثال ہے۔ کلام ملاحظہ کیجیے

سجن کا تبسم ، سجن کا تکلم ، سجن کی ادائیں ، سجن کی یہ قامت
ہے فردوسِ غنچہ ، ہے باغِ فصاحت ، سراپا لطافت ، قیامت قیامت

سجن کی جبیں پر، سجن کے رخ اوپر، سجن کے بھواں پر، سجن کی کمر پر
ہے زہرہ تصدق، ہے خورشید مائل، ہے قرباں کمانیں، فدا ہے نزاکت

تری کالی آنکھیں، تری کالی زلفیں، تری کالی پلکیں، ترا خطِ مشکیں
سیہ مست آہو، ہے ناگن کا جوڑا، سیہ تاب نشتر ہے، ریحانِ جنت

ہماری زبان ہے ، ہمارا سخن ہے ، ہمارا قلم ہے ، ہمارا رقم ہے
ثنا خوانِ بلبل ، معانی کا گلشن ، نہالِ مقطع ، مرصع زراعت

ہماری جوانی ، ہماری ضعیفی ، ہمارا قدِ خم ، ہمارا تواضع
ہے معدوم عاجزؔ، ہے آثارِ رحلت، ہے دام ہلاکت، ہے ہمدوشِ تربت

اس غزل کے تمام مصاریع اولیٰ کے ساتھ مصاریع ثانی میں مناسبات کا جو دلفریب گلشن سجایا ہے وہ عاجزؔ کی قادرالکلامی پر دال ہے۔ ان میں صرف قافیہ پیمائی نہیں بلکہ مضمون آفرینی اور معنی آفرینی بھی ہیں۔

اب اس غزل کے پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں اشیاء کی ترکیب کو مصرع ثانی کی مناسبات سے ملا کر پڑھیے اور لطف اندوز ہوتے رہیے۔ شاعر کی شوخی اور بانکپن کی بھی داد دیجیے

سجن کا تبسم ہے فردوسِ غنچہ سجن کا تکلّم ہے باغِ فصاحت
سجن کی ادائیں سراپا لطافت سجن کی یہ قامت قیامت قیامت

☆☆☆

منابع :

(۱) تذکرہ تحفۃ الشعراء : میرزا افضل بیگ خاں قاقشال۔ مرتبہ حفیظ قتیل (اشاعت ۱۹۶۱ء)

(۲) تذکرہ چمنستانِ شعراء : لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی۔ مرتبہ مولوی عبدالحق (اشاعت ۱۹۳۸ء)

(۳) تذکرہ گلشنِ گفتار : خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی۔ مرتبہ ایم۔ کے۔ فاطمی (اشاعت ۱۹۶۳ء)

(۴) تذکرۂ ریاض حسنی : خواجہ عنایت اللہ فتوت اورنگ آبادی۔ مخطوطہ (زیراکس کاپی مملوکہ اسلم مرزا)

(۵) اردو شاعری میں صنائع وبدائع : ڈاکٹر رحمت یوسف زئی (اشاعت ۲۰۰۳ء)

(۶) شمیم بلاغت : مرتبہ اخلاق دہلوی (اشاعت ۱۹۶۸ء)

(۷) مقدمۂ شعر و شاعری : الطاف حسین حالیؔ (اشاعت ۱۹۹۳ء) اتر پردیش اردو اکادمی

(۸) تذکرہ نکات الشعراء : میر تقی میرؔ۔ مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی (اشاعت ۲۰۰۳ء)

❑❑❑

اسلم مرزا

9960053707

افسانہ

سکیسر کی بتیاں......

وقار احمد ملک

میرا نام بلقیس ہے۔صرف بلقیس، آگے پیچھے کچھ نہیں۔ ہاں بچپن میں مَیں بلقیس زماں ہوا کرتی تھی جو نام میرے باپ کی دین تھا اور شادی تک میرے ساتھ لگا رہا۔ بعد میں مَیں بلقیس زماں سے بلقیس ستار بن گئی۔ یہ نام میرے شوہر کی وجہ سے میرے ساتھ لگا جو تیس سال میرے ساتھ چمٹا رہا۔ ستار نمایاں رہا اور بلقیس معدوم۔ پھر ستار بھی غائب ہو گیا ایسے جیسے زماں غائب ہوا تھا اور بلقیس کا نام ابھرتا چلا گیا۔ اب صرف بلقیس ہے۔ کسی لاحقہ کے بغیر، کسی سابقہ کے سوا۔ آزاد فضا میں سانس لیتا ہوا یہ نام بادِ بہاری میں لرزاں کمزور گلِ داؤدی کی طرح اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بچپن میں جب بابا میری چپلوں اور مکوں سے پٹائی کیا کرتے تھے تو میری جان بچانے کے لیے ماں قریب نہ آتی۔ کیسے آتی، اسے مجھ سے زیادہ مار پڑتی۔ بابا مار مار کے تھک جاتے تو کھٹے پسینے میں بھیگی لمبی چوڑی مونچھ کو اپنے پیلے رومال کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتے۔ چولھے میں لکڑیاں پھونکتی ماں کنکھیوں سے اسے باہر جاتا دیکھتی۔ جب دروازے کا پٹ زور سے بند ہوتا تو وہ اٹھ کر میرے پاس آتی اور میرے زخموں کو سہلا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیتیں۔ حالانکہ میں اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ ماں کی گود میں بیٹھنا معیوب نہیں تو عجیب ضرور محسوس ہوتا تھا۔ میرے بابا کا نام شیر زماں تھا۔ وہ تعلیم خاص کر لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف تھا۔ لیکن ماں مجھے پڑھانا چاہتی تھی اور مجھے چوری چھپے گھر کے ساتھ والی دوکان سے کاپی، قلم، دوات، تختی اور کتاب لا کر گھر پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ خود آٹھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی اور مجھے دس تک پڑھانے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ جب کبھی بابا میرے ہاتھ میں قلم کتاب دیکھ لیتا تو میری شامت آ جاتی اور میری ٹھیک ٹھاک درگت بنتی۔

میری ایک خالہ سون کی وادی میں رہتی تھی جس کا شوہر یعنی میرا خالو سکیسر کی چھاؤنی میں افسر لگا ہوا تھا۔ ایک دفعہ سخت گرمیوں میں بابا بیمار ہوا تو خالو اور خالہ تیمارداری کے لیے آئے اور چند دن ہمارے پاس رہے۔ بابا ٹھیک نہ ہوا، الٹا بیماری نے زور پکڑ لیا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کو ٹی بی تھی جس کے لیے پرفضا مقام پر ہی وہ ٹھیک ہو سکتے تھے۔ خالو کے کہنے پر ہم سب ان کے ساتھ سکیسر چلے گئے جہاں انہوں نے بابا کو سرکاری ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ جولائی اگست کو دو مہینے ہم نے سکیسر میں گزارے جہاں ان گرم مہینوں میں بھی موسم خوشگوار تھا۔ سکیسر میں خالہ کا گھرانہ ایک کوارٹر میں رہائش پزیر تھا جس کے دو بڑے بڑے بلند چھتوں والے کمرے ہم دو خاندانوں کے لیے کافی تھے۔ میرا خالہ زاد جس کو سارے تارا تارا کہتے تھے اس وقت دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بابا ہسپتال میں داخل ہو گیا تھا۔ خالہ نے تارے بھائی کو کہا کہ مجھے لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ میری عمر اس وقت کوئی دس بارہ سال ہو گی۔

دو مہینوں میں مَیں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں پڑھنے کے قابل ہو گئی۔ خالہ کے گھر میں شہتوت کے دو درخت ہوا کرتے تھے۔ ایک پر کالے اور دوسرے پر سفید توت لگتے۔ تارا اور میں ان درختوں کی چھاؤں میں پڑھا کرتے۔ مجھے کالے توت کا درخت پسند تھا اور اس کے نیچے دری بچھا کر بیٹھ جاتی۔ تاری آتا تو وہ دری گھسیٹ کر سفید توت والے درخت کے نیچے لے جاتا۔ اس کے مطابق کالے توت اس کے سفید لباس کو خراب کر دیتے ہیں۔ میں خاموشی سے درختوں کی چھاؤں تبدیل کر کے اس کے پاس بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیتی۔ تاری اور میں شام کو بابا کا کھانا ہسپتال دے کر واپس آ رہے ہوتے تو خالہ کے کوارٹر کے چھجوں پر لگے دو بلب دور سے ہی نظر آنا شروع ہو جاتے۔ تاری اور میں ہسپتال میں کھانا دے کر جلد ہی باہر نکل آتے اور پھر سکیسر کی گلیاں ماپا کرتے۔ یہ علاقہ اردگرد کے میدانی علاقوں سے بہت بلندی پر قائم ہے۔ چاروں طرف گہرائیوں میں پھیلی ہوئی زمین گھاٹیوں کی شکل میں دکھائی دیتی۔ مشرق کی طرف نوشہرہ، خوشاب، جوہر آباد اور دور سرگودھا کی روشنیاں تاریکی میں جھلملاتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ مغرب میں کوسوں دور میانوالی اور مضافات، شمال میں لاوہ، چکڑالہ، رکھی اور جنوب میں قائد آباد، واں بھچراں اور بندیال کے شہر ٹمٹماتے ہوئے دکھائی دیتے۔ میں اپنے آپ کو نیچے میدانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں سے بہت ارفع اور اعلیٰ محسوس کرتی۔ سکیسر کی ٹھنڈ میں میدانی گرمی کا احساس جاتا رہا تھا۔

تاری اور میں شام کو چادریں لپیٹ کے گھوما کرتے تھے۔ نیچے جب ہم گھر میں تھے تو بڑے سے صحن میں پنکھے کے آگے بھی پسینے میں شرابور ہانپتے کانپتے راتیں گزارا کرتیں۔ اگست کے مہینے میں ساون کی گھٹائیں اٹھنا شروع ہوئیں تو یہاں کا حسن اور بھی نکھر گیا۔ جانے کہاں سے سلیٹی، سفید، نیلے اور کالے کالے بادل بجلی کی سی تیزی سے اُمڈ آتے اور منٹوں میں چھما چھم بارش برسنا شروع ہو جاتی۔ پھر اچانک بارش یوں رکتی جیسے باتھ روم کا شاور کسی نے بند کر دیا ہو۔ اور پھر بادل بھی اپنا بوریا بستر لپیٹ کر دور بھاگ جاتے۔ برسات میں یوں لگتا تھا کہ جیسے دسمبر کا مہینہ آ گیا ہے۔ رات کو کمروں میں بند کمبل اوڑھ کر سوتے اور صبح کی دھوپ میں گیلے گیلے جسموں کو سینکا کرتے۔

میری پڑھائی جاری تھی۔ برسوں کے سبق چند دنوں میں یاد کرنے کی سعی میں مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں نے اچھا خاصا پڑھنا لکھنا سیکھ لیا ہے۔ اب میں نے خالہ کے گھر پڑے پرانے ٹوٹ بوٹ اور جگنو نامی بچوں کے رسالے پڑھنا شروع کر دیئے۔ اماں مجھے پڑھتا دیکھتیں تو خوشی سے مسکرانا شروع کر دیتیں۔ جب میں اور تاری سفید توت کے درخت کے نیچے دنیا مافیہا سے بے نیاز پڑھائی میں مصروف ہوتے تو اماں اور خالہ تھوڑی دور برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی خاندانی لوگوں کی برائیاں کرنے میں محو ہوتیں۔ پھر اچانک کبھی کبھار ان کی آوازیں پست ہو کر سرگوشیوں میں بدل جاتیں اور نظروں کے عدسے ہمیں گھورنا شروع کر دیتے۔ دونوں بہنوں کے ہونٹوں پر میلی سی مسکراہٹ بھی کھیلتی رہتی۔ خالو کے آنے کا وقت ہوتا تو خالہ پڑھائی ختم کر کے چٹائی لپیٹنے کا کہہ کر باورچی خانے میں چلی جاتیں۔ میں ماں کے ساتھ بائیں جانب کے کمرے میں جا بیٹھتی جہاں ہمارا سامان پڑا رہتا تھا۔ ہمیں جو کمرہ دیا گیا تھا اس کے سامنے تھوڑا فاصلے پر ریسٹ ہاؤس کی پرانی عمارت موجود تھی۔ اس کے بائیں جانب گہری وادی اور پھر دور میدانی آبادیاں اپنی موہوم سی موجودگی کا احساس دلوا رہی ہوتیں۔ توت کے دونوں درخت سبز کچور پتوں سے بھر چکے تھے۔ فرش کالے اور سفید توتوں سے بلیک

اینڈ وائٹ فلم جیسا ماحول پیدا کر رہا ہوتا۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوائیں آ کر ہمارے سینے سے لگ کر جسموں کو گدگداتیں۔ مجھے پہلی دفعہ جسم میں گدگدی کا احساس ہوا لیکن وہ دن ہمارے وہاں قیام کا آخری دن تھا۔ بابا اب ٹھیک ہو گئے تھے لیکن بیماری نے ان کو دو مہینوں میں بوڑھا کر دیا تھا۔ سکیسر میں ہمارے قیام کے آخری دن زوروں کی بارش ہوئی تھی۔ کالے بادلوں سے گرتے ہوئے سفید موتیوں جیسے قطرے دھلے ہوئے پہاڑ کو دوبارہ نہلا رہے تھے۔ ہر طرف ساون کی ہریالی شاخوں، پتوں، ٹہنیوں اور پھلوں پھولوں کی شکل میں رقص کناں تھی۔ تاری نے آخری سبق برآمدے کی سرخ ٹائلوں پر دیا۔ جب ہم نکلنے لگے تو اس نے اندر سے ایک سکول بیگ لا کر مجھے دیا جس میں کتابیں، کاپیاں اور کہانیوں پر مشتمل رسالے موجود تھے۔ بیگ کو دیکھ کر میں ڈر گئی کیونکہ بابا ٹھیک ہو چکے تھے اور بابا کے ہوتے ہوئے سکول بیگ کی موجودگی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ لیکن جب بابا کو ہسپتال سے گھر لایا گیا تو وہ سویا سویا اور خاموش تھا۔ اسے ہم لوگوں یا اس خوبصورت موسم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جب سکیسر سے بس چلی تو ٹھنڈ کی وجہ سے ہمیں بس کی کھڑکیوں کے شیشے بند کرنے پڑے۔ لیکن جوں جوں بس پہاڑوں سے نیچے اترتی گئی موسم بدلتا گیا۔ آدھے گھنٹے میں ہی گرمی کا احساس ہونے لگا اور ہم نے کھڑکیوں کے شیشے کھول دیے۔ جب گھر پہنچے تو شام کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گاؤں کی چھوٹی چھوٹی دیواروں سے جلتے ہوئے تنوروں کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ گرمی زوروں پر تھی۔ پورا گاؤں اپنے صحنوں میں چارپائیاں بچھائے شام کے گرم اور حبس بھرے لمحات گزارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہاڑوں پر ہونے والی بارش میدانی علاقوں کی گرمی میں حبس کی اضافہ کر دیتی ہے۔ رات گئے گرمی اور حبس کی شدت میں کمی ہوئی تو مچھروں نے حملہ کر دیا۔ رات اٹھتے بیٹھتے کٹی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ ہم اسی گاؤں کے باسی تھے اور اسی ماحول میں ساری زندگیاں گزاری تھیں۔ رات دو بجے بابا نلکے کے نیچے نہا رہے تھے اور میں نلکا چلا رہی تھی۔ نلکے کی ہتھی چلاتے ہوئے پورا جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ اچانک میرے نگاہیں دور شمال کے آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ اماوس کی اندھی رات میں سکیسر کے پہاڑ پر روشنیاں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ سکیسر کی بتیوں کو دیکھتے ہی میرے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ نلکے کی ہتھی کے چلنے کی رفتار میں اچانک اضافہ ہوا تو بابا نے زور سے گالی دی۔ ماں مری ہو لے گیر نلکا۔

بابا کے مرنے کے بعد میری شادی عبدالستار سے کر دی گئی۔ وہ عمر میں مجھ سے پندرہ برس بڑا تھا۔ گھر اتنا بڑا کہ چاردیواری کی دیواریں ہی نہ تھیں۔ ساری دھرتی اپنی معلوم ہوتی۔ اس گھر میں دن کے وقت عورت اور مرد میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ زمینوں کی مشقت ہو یا جانوروں اور مویشیوں کے کام، سب ایک ساتھ کیا کرتے۔ صبح تڑکے کام میں جوتا جاتا اور رات گئے گردن سے پٹا اترتا۔ ستار کا سلوک میرے ساتھ عجیب انداز کا تھا۔ وہ مجھے کچھ نہ کہا کرتا۔ نہ زیادہ کام پر خوش ہو کر شاباش دیتا نہ کام نہ کرنے پر توفتم کرتا۔ بس اسے خود کام کرنے کا شوق تھا اور وہ جانوروں سے بڑھ کر کام کیا کرتا۔ میری باگیں میری ساس چاچی شیموں کے ہاتھوں میں تھیں۔ اماں اب گاؤں چھوڑ گئی تھی اور میانوالی میں اپنی بیوہ ماں کی خدمت کر رہی تھی۔ میں کبھی کبھی اس کو ملنے جاتی لیکن جلد ہی اپنے گھر کے کام کاج کے باعث مجھے لوٹنا پڑتا۔ میرے معمول میں دو بھینسوں کی دیکھ بھال اور باورچی خانے کا کام تھا۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے۔ جب رات کو تھک کر چارپائی پر گرتی تو سونے سے پہلے شمالی آسمان کو ایک نظر لازمی دیکھا کرتی جہاں سکیسر کی بتیاں جھلملاتی ہوئی خاموشی کے ساتھ مجھے اپنی طرف بلا رہی ہوتیں۔ میں دیر تک ان بتیوں کو دیکھتی رہتی۔ کبھی خوابوں اور خیالوں میں یوں لگتا کہ میں توت کے درختوں تلے تاری کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں اور وہ مجھے

سبق پڑھا رہا ہے۔ برآمدے میں خالہ اور اماں ہمیں دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔ خالہ کے گھر کی کیاری میں سے اُٹھتی ہوئی موتیے اور چنبیلی کی خوشبو سکیسر کو جنتِ ارضی بنا رہی ہے۔ لیکن اس جنت میں قیام عارضی ثابت ہوتا۔ بھینسوں کے باڑے سے اُٹھنے والی بدبو کے بھبوکے زیادہ دیر میرے خیالستان کو معطر نہ رہنے دیتے۔

تین دہائیاں بھینسوں ، زمینوں، صحن اور کچے کوٹھوں کے ساتھ ساتھ عبدالستار کی خدمت پوری ہوئی تو اچانک سب کچھ تیزی سے بدلنے لگا۔ ٹی بی نے ایک دفعہ پھر سر اٹھا لیا تھا۔ اس مرتبہ اس کا نشانہ میرا خاوند تھا۔ وہ سال سے زیادہ بستر پہ پڑا تھوکتا رہا۔ اب کے کسی نیہاڑوں پہ جانے کا مشورہ نہ دیا۔ بیماری لمبی ہوئی تو بھینسیں بھی بیچنا پڑیں۔ زمین خاندانی وارثوں میں تقسیم در تقسیم ہوتی ہوئی محدود ہو چکی تھی۔ عبدالستار کے آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ اس کی بہنوں اور بھائیوں نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تیسرے دن ہی مجھے گھر سے نکال دیا گیا اور میں ایک دفعہ پھر اپنی ماں کے پاس پہنچ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی کیونکہ وہ بھی ایک تنہا زندگی بسر کر رہی تھی۔ نانی کو فوت ہوئے تیسرا سال تھا۔

دو دم اکیلے اس بڑے سے مکان میں رہ رہے تھے۔ کبھی کبھی تو اس کشادگی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا۔ دن کو محلے کے بچے ہمارے گھر میں آ جایا کرتے اور خوب چھپن چھوت ، پیٹو گرم ، اخروٹ ، بنٹے اور چم چڑیا کوڑا کوڑا کھیلا کرتے۔ اماں جواب شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ بن چکی تھی آہستہ آہستہ خاموش ہوتی چلی گئی۔ میں نے محلے کے چھوٹے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ صبح سے شام کرنا پھر بھی مشکل بنا رہا۔ زندگی مال گاڑی کی طرح دھیرے دھیرے آگے کی طرف بڑھنے لگی۔

سخت گرمیوں میں اماں فوت ہوئیں تو میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ محلے کی ایک بے سہارا بوڑھی خاتون نے اب میرے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس خاموش طبع عورت کی موجودگی برائے نام تھی۔ ماسی نوراں بہت کم بولا کرتی۔ زیادہ وقت وہ جائے نماز پر نماز تسبیح میں گزار دیتی۔

گرما زوروں پر تھا۔ دن گیارہ بجے گلی محلے خاموش ہو جاتے۔ دوکانیں بند ہو جاتیں۔ لوگ رات کی طرح آرام کرنے لگتے۔ بچے بھی اپنے گھروں میں واپس چلے جاتے۔ گرمی جتنی بھی شدید کیوں نہ ہوتی ماسی تین چار گھنٹے دن کو لازمی سویا کرتی۔ جولائی اگست کے مہینے میں رات حبس ہوا کرتا تھا اور پنکھے کے باوجود نیند نہ آتی۔ ایک رات ماسی نوراں اور میں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ نوراں اپنی زندگی کا نچوڑ پیش کر رہی تھی۔ اس کے مطابق عورت کی زندگی سہاگ اور بچوں تک ہی ہوتی ہے۔ ورنہ زمین کے نیچے اور اوپر ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے محلے دار عورتوں سے سن رکھا تھا کہ نوراں کا شوہر اس بیچاری پر بڑا ظلم کیا کرتا تھا۔ اس کا کام رنڈیوں کے پیچھے بھاگنا اور چرس کے سوٹے لگا کر گلیوں میں گھومتے ہوئے لوگوں کے گھروں میں جھانکنا ہوتا۔ نوراں کے دو بیٹے تھے۔ دونوں نشئی بن گئے اور گھر کی ہر چیز بیچ کر نشے میں پھونک دی۔ باپ کی طرح بیٹے بھی نوراں کو پیسوں کی طلب میں گالیاں دیا کرتے اور کبھی کبھی تو مارا بھی کرتے تھے۔ لیکن مجال ہے کہ نوراں نے کبھی کسی کے سامنے ان تین مَردوں کے خلاف کبھی زبان بھی کھولی ہو۔ آج بھی وہ عورت کے لیے مَردوں کا حصار ضروری قرار دے رہی تھی۔ جانے کیوں مجھے نوراں کی منافقت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں بلقیس زماں سے بلقیس ستار بن گئی لیکن زندگی کا جو مزہ اکیلی بلقیس میں تھا وہ لمبے ناموں والی بلقیس میں کہاں۔

گرمی اور حبس کے باوجود نوراں سو گئی۔ میں چھت پر آ گئی کہ شاید ہوا کا کوئی جھونکا تپتے ہوئے جسم میں ٹھنڈک کا احساس پیدا کر جائے۔ چھت پر چاروں طرف سناٹا تھا۔ اندھیرے، خاموشی اور خوف کی ملی جلی بے کیف فضا میں میری نظریں مشرق کی طرف اُٹھ گئیں۔ دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سکیسر کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ سکیسر کے باسی کمروں میں کمبل اوڑھے مطالعہ میں مصروف تھے یا پھر سکیسر کی خاموش گلیوں میں چپکے چپکے چہل قدمی میں مصروف تھے۔ خالہ کے کوارٹر کے چھجوں پر لگے دو بلب سکیسر کی روشنیوں میں اضافہ کر رہے تھے۔

وقار ملک
یونیورسٹی آف پنجاب
میاں والی پاکستان
+923006080361

افسانہ

دراڑ

غلام مجتبیٰ اعوان

اس مکان کی دیوار کو جب آج غور سے دیکھا تو مجھے لگا کہ اس میں آئی یہ دراڑ کچھ بول رہی ہے، میں جب قریب ہوا تو پتہ چلا کہ میرے سامنے دراڑ کا دائیں طرف والا کونہ دوسری طرف کے کونے سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جب نگاہیں بند کر کے اور سماعتوں پہ توجہ ڈال کے سنا تو مجھے دائیں سمت والے کونے سے آواز آئی..... ''کاش ہماری اینٹیں اور مسالہ بھی کسی امیر گھر کی تعمیر میں لگا ہوتا، تو آج ہماری بھی مرمت ہو چکی ہوتی، بلکہ ہم ٹوٹتی ہی نہیں''۔

تو اس کے جواب میں بائیں سمت والی دراڑ کا کونہ بولا۔

''بے شک آج ہم میں کچھ جدائی آ چکی ہے، لیکن اس مکان کے مالکوں کے دلوں میں دراڑ نہیں ہے۔ یہ محبت سے رہتے، اور ان کے دلوں میں ہمارے ساتھ بہت محبت اور قربت ہے۔

ابھی کل ہی ہمارا مالک مکان ہمیں حسرت زدہ نگاہوں دیکھ رہا تھا اور اس کی داڑھی کے سفید بال اس کے آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے۔ اور وہ بار بار اپنے نرم ہاتھ سے ہمیں سہلا رہا تھا، جیسے کوئی باپ اپنی اولاد کو پیار سے سہلاتا ہے، کوئی بات نہیں انسان بھی تو مر جاتا ہے اگر آج ہم تھوڑے دور ہو گئے ہیں اور تھوڑی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں تو کیا ہوا، لیکن ہماری خستہ حالت نے اس خاندان کو چھت تو مہیا کی ہوئی ہے ناں۔''

دائیں سمت والے کونے کی آواز آئی............

''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ واقعی ہمارے مالکان کے دل محبت کے مسالے سے جڑے ہیں، جو امیر لوگوں میں کم یاب ہے۔ بہر حال اب اگر یہ ہمیں جوڑ نہیں سکتے، تو ہم خود ہی اپنے اس خلا کو کسی حیلے سے بھر نہ دیں......؟''

اس دن کے تقریباً ایک ماہ بعد جب میں وہاں سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ اک ننھی چڑیا نے وہاں پہ گھونسلہ بنایا ہوا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے چڑیا کے بچے چہچہا رہے ہیں اور دراڑ کے دونوں کونوں کو جس زاویے سے میں دیکھ رہا تھا، مجھے ایسا لگا کہ جیسے دو ہونٹ مسکراہٹ کی وجہ سے کھلے ہوئے ہیں اور محبت بانٹ رہے ہیں۔

❑❑❑

غلام مجتبیٰ اعوان
وادی سون پنجاب پاکستان
+923026591492

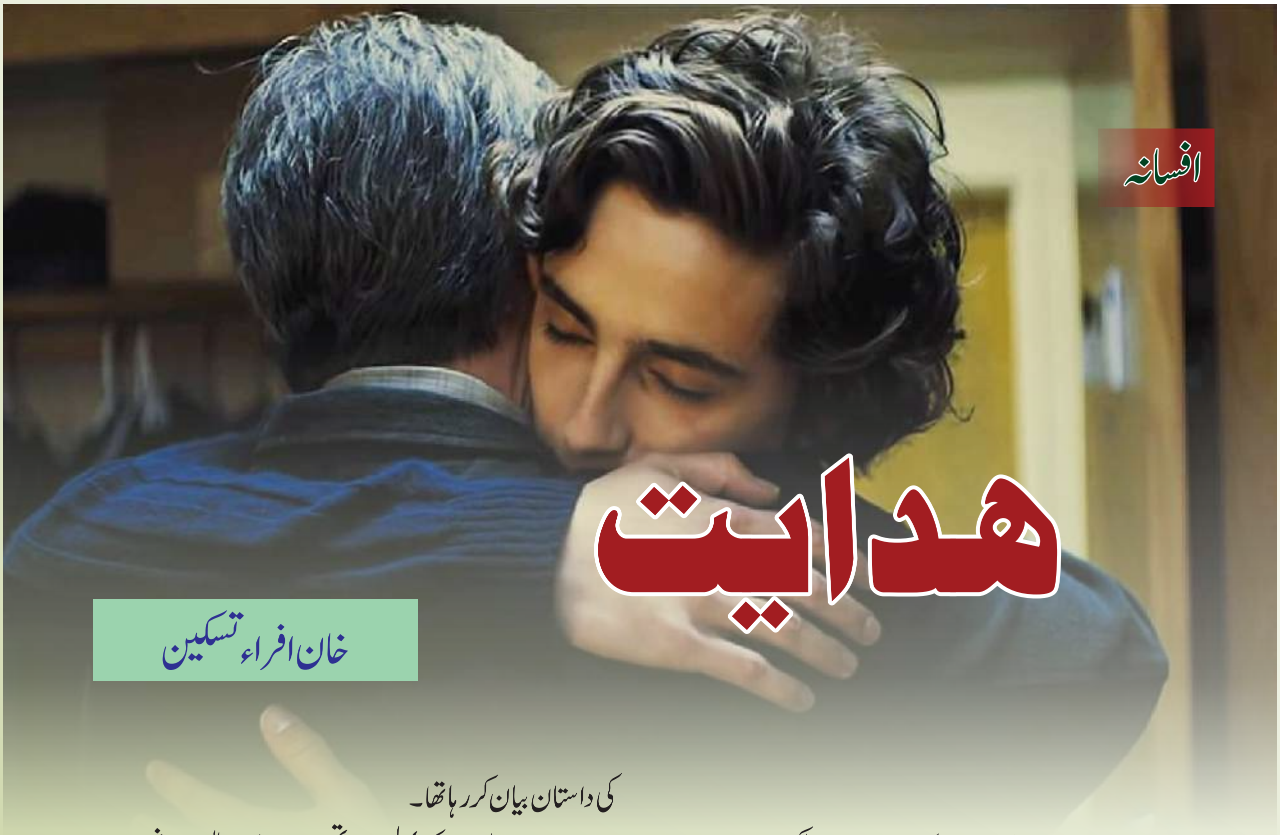

افسانہ

ہدایت

خان افراء تسکین

رات سوچا ابو آپ کے احسان لکھوں
ہو گئی صبح ، کیا کیا میں نادان لکھوں
میرے الفاظ نہیں قابل آپ کی شان کے
میں کسی طرح آپ کی ہستی کے عنوان لکھوں

نہ جانے اچانک سے کیا ہو گیا وہ میرے سینے سے آ لگا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اس کے چہرے پر آنسو کی قطار بہہ رہی تھی، اور آنکھوں میں ایک الگ سی نمی اور خود سے نفرت کا اظہار تھا۔اس درد اور افسوس کے بیچ، وہ شاید اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے ندامت اس کی آنکھوں سے آنسو کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی۔

اس دن ایک ایسے پل کا سامنا ہوا جو کبھی بھولنا ممکن نہیں ہوگا۔ دونوں کا چہرہ آنسوؤں سے بھر گیا تھا۔احمد صاحب کی آنکھوں میں اپنے بیٹے سے پیار و محبت کا ایک عجیب سا احساس تھا، جبکہ دانیال کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بارش کی طرح بہہ رہے تھے۔دونوں کی آنکھوں سے بہتے آنسو اور احمد صاحب کے سینے سے لگنے کا یہ منظر، باپ اور بیٹے کی آپس میں بے پناہ محبت کی داستان بیان کر رہا تھا۔

دانیال ان کی پہلی اولاد تھی جسے اللہ تعالی نے انہیں بہت عرصے بعد نوازا تھا۔جسے بہت دعاؤں، امیدوں، اور نمازوں میں مانگا گیا تھا۔

دانیال کی پیدائش وہ لمحہ تھا جس نے احمد صاحب اور ان کی اہلیہ کو ایک نئی زندگی اور نئے سفر کا آغاز کرنے کی دعوت دی، کیونکہ دانیال اللہ کی طرف سے بہت صبر کے بعد بھیجا گیا تھا اسی لیے وہ اپنے والدین کو اپنی جان کی طرح عزیز تھا۔بچپن ہی سے بے جا لاڈ پیار کا عادی، جس کی ہر خواہش پر اس کے والدین نے ہامی بھری۔آج وہ جوانی کے اس موڑ پر تھا کہ وہ اپنے والدین سے گالی گلوچ کرتا۔

اس کا یہ معمول تھا کہ وہ آدھا دن گزرنے کے بعد اٹھتا اور اٹھ کر یا تو اپنے فون پر وقت گزارتا، یا پھر گلی کے آوارہ دوستوں میں چلا جاتا۔چونکہ احمد صاحب مالی اعتبار سے بہت ہی رئیس تھے۔اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے کو آسائش کے لیے ہر چیز دی تھی۔سارا دن اپنے والد کے حلال کمائے ہوئے پیسے وہ اپنے نکمّے دوستوں پر اڑا دیتا۔آدھی آدھی رات تک وہ گھر نہیں آتا تب تک احمد صاحب اور ان کی اہلیہ اس کا انتظار کرتی اور بھوکے بیٹھے دروازے کی جانب آس لگائے ہوئے وہ دونوں اپنے بیٹے کا انتظار کرتے۔

جب وہ گھر آتا تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

احمد صاحب جب بھی کچھ کہتے وہ ان سنی کر دیتا۔ ایسے لگنے لگا تھا جیسے ان بوڑھے ماں باپ کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ احمد صاحب روزانہ نماز میں اللہ سے رو رو کر دعا مانگتے کہ یا اللہ میری ایک ہی اولاد ہے میں نے بہت ہی محبت سے اسے پالا ہے، یا اللہ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تو اسے صراط مستقیم پر چلا، یا اللہ اسے سیدھی راہ دکھا دے، یا اللہ وہ بھٹک چکا ہے اس سے ہونے والی ہر خطا کو معاف فرما، اس کے سارے گناہ میرے حصے میں ڈال دے۔ روزِ محشر میری ساری نیکیاں اسے دے دینا۔

وہ آج بھی اپنی اولاد سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جیسے وہ دانیال سے اس دن کرتے تھے جب وہ پیدا ہوا۔ اور دانیال کی اتنی بدتمیزیوں کے بعد بھی ان کی محبت اس کے لیے کبھی کم نہیں ہوئی بس بڑھتی چلی گئی۔ 3 سال ہو چکے تھے دانیال کو امریکہ سے واپس آئے ہوئے۔ اس نے کبھی احمد صاحب کے ساتھ بیٹھ کر بات نہیں کی۔ احمد صاحب اور ان کی اہلیہ کو صرف ایک امید زندہ رکھے ہوئے تھی اور وہ تھی کہ اللہ کسی نہ کسی دن اسے ہدایت دے دیں گے۔ نہ جانے اس دن دانیال نے خواب میں کیا دیکھا، وہ نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا اور آ کر احمد صاحب کے گلے لگ کر معافی مانگنے لگا۔ بہت اصرار کے بعد دانیال نے بتایا کہ کل رات جب میں اپنے بستر پر گیا، میں اپنے جوتوں کے ساتھ سو گیا۔ ابا جان نے جوتے نکالے اور اس کے بعد وہ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آیت الکرسی دم کرنے لگے اور وہ میرے کمرے سے چلے گئے۔ میں نے اپنے خواب میں دیکھا کہ میرے والدین نے بچپن سے ہی کس طرح مجھ سے بے لوث محبت کی ہے۔ میں روزانہ دیکھتا کہ آپ آدھی رات تک میرا انتظار کرتے اور میں کمبخت آپ سے اس طرح پیش آتا، میں کل مسجد بھی گیا۔ میں نے قرآن مجید میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ عزت اور نرمی کا برتاؤ کرو، خاص کر جب وہ بڑھاپے کو پہنچیں۔ ''اُف'' کہنا بھی منع کیا گیا ہے جو کہ کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی نفرت یا ناگواریت کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی حکم دیا کہ ان کے لیے دعا کرو، جیسے انہوں نے آپ کو بچپن میں پیار اور شفقت سے پالا تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دیں۔ احمد صاحب کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ ان کی آنکھوں میں پھر سے شکر کے آنسو تھے۔

دور حاضر میں اولاد کا اپنے والدین سے بہت برا سلوک کر رہی ہے۔ اولاد والدین کے مقام بھول چکی ہے۔ والدین کون ہیں؟ جنت میں جانے کے لیے ہم اتنی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے والدہ کے قدموں کے نیچے جنت رکھ دی۔ والد کو جنت کا دروازہ بنا دیا۔ اور ہم کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم اصل جنت کی نافرمانی کر کے کیا ہم جنت میں ڈال دیے جائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے والدین ہم سے راضی ہوں گے تو ہمارا رب ہم سے راضی ہوگا۔

والدین کی دعاؤں کا ہے زندگی پہ اثر
ان کے بنا ہر راستہ ہے بے اثر۔

❑❑❑

تحریر۔ خان افراء تسکین (اورنگ آباد)
فون نمبر9545857089

افسانچے

محمد جاوید خادم
اوستا محمد بلوچستان

پچھتاوا

جاوید صاحب کبھی کبھار نماز پڑھتے تھے۔
روزہ، زکوٰۃ اور حج سے بھی غفلت تھی۔
جاوید صاحب کے انتقال سے پہلے ان کی بیگم انھیں اکثر کہا کرتیں۔
جاوید، استغفار کرلو!
اس سے پہلے کہ
وقت دعا گل ہوجائے
یہ نہ ہو کہ
در توبہ مقفل ہوجائے
جاوید صاحب نے عمر کے گزارے حصے میں،
نماز، وتر اور روزوں کی پابندی نہ کی۔
زکوٰۃ اور حج فرض ادا نہ کیا۔
کسی سے لیا قرض واپس نہ کیا۔
کبھی قربانی نہ دی۔
سجدۂ تلاوت رہ گئے۔
آخری عمر میں احساس پیدا ہوا۔
لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔

☆☆☆

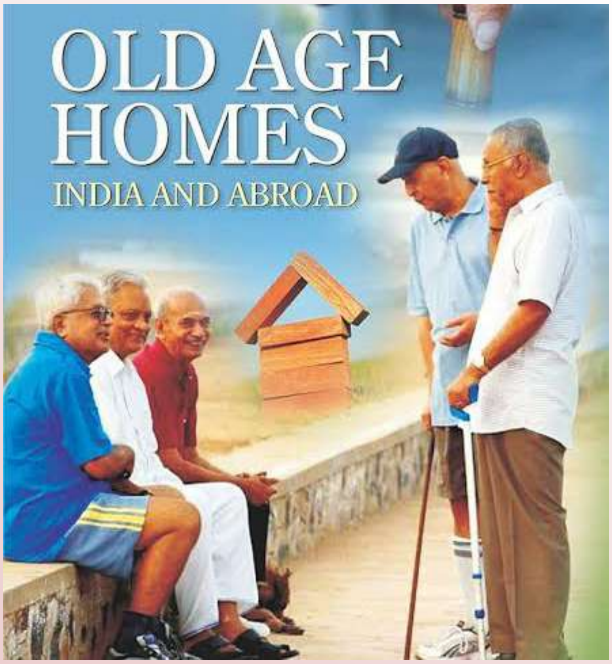

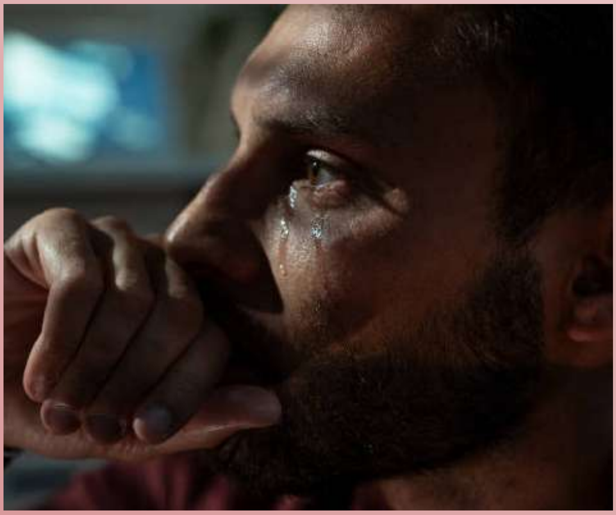

والد کی تکریم

وہ ساری زندگی اپنے بچوں کی کفالت کرتا رہا۔
دن رات محنت کر کے اپنے خون پسینے کی کمائی سے ان کی پرورش کی۔
ان کے روشن اور تابناک مستقبل کے لئے کوشاں رہا۔
آجر کی غلامی کی۔ تلخ ترش باتیں سہیں۔
زمانے کے بے رحم تھپیڑوں سے حفاظت کی۔
ان کا بڑا خیر خواہ اور سچا دوست بنا۔ ایثار و قربانی کا مجسم ہوا۔ سراپا دعا بھی رہا۔
پھر ایک دن اس پر بڑھاپا آیا۔
بچے جوان اور مصروف ہو گئے۔
ان کے پاس بیٹھنے اور ان کی دل جوئی کا وقت نہ تھا۔
وہ انھیں اولڈ ہوم چھوڑ آئے۔

☆☆☆

فتح

میں زندگی کو فتح کرنا چاہتا ہوں
میں نے فرشتے سے کہا۔
روح ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہے۔
لیکن جسم ایک دن مرجاتا ہے۔
فرشتہ یہ کہہ کر چلا گیا۔
میں نے زندگی کی عمر خضر سی دعا مانگی۔
دنیا کے اعلیٰ ترین ڈاکٹروں سے اپنا علاج شروع کرالیا۔
زندہ رہنے کے لئے مصنوعی ہارٹ لگوایا۔
فیل ہوئے گردے تبدیل کرائے۔
جگر کی بھی پیوندکاری کرائی۔
چندسال یوں ہی زندگی کو فتح کرتے کرتے گزار لئے۔
دماغ میں ٹیومر ہوگیا۔
پھر ایک دن فرشتہ آیا۔
اس بار آپ کی زندگی کی میعاد پوری ہوگئی ہے۔

☆☆☆

سانجھی

وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ایک دوسرے سے زندگیاں جڑی ہوئی تھیں۔دکھ سکھ ساتھ ساتھ جڑے تھے۔

رشتوں میں بھی تعلق ایک سا تھا' پر کچھ فرق تھا ان میں' اسی لئے عموماً'' آپس میں بات چیت اور خوشی غمی میں احساس نہیں کرتے تھے۔عید' سالگرہ پر آپس میں مبارکبادیں نہیں دیتے تھے۔

وہ گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے دعوے دار تھے۔سربراہ البتہ ایک نہیں تھا۔جبکہ گھر میں رشتوں کی کفالت اور ضروریات زندگی وراثت کے پیسوں سے پوری ہورہی تھیں۔

ماں بھی ایک تھی اور باپ بھی!
لیکن، محبتیں سانجھی نہیں تھیں۔

☆☆☆

درِ خلد

باپ جنت کا دروازہ ہے۔
ماں نے کہا۔
میں نے یوں سر ہلایا جیسے بات سمجھ گیا۔
وہ سمجھ گئیں کہ میں نہیں سمجھا۔
بطور یتیمی میری زندگی کا پہلا دن تھا۔
ماں نے مجھے ایک کاغذ کا ٹکڑا دیا۔
ماں نے اس کاغذ کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا۔
جانتے ہو، اس پر کیا لکھا ہے؟
ماں نے پوچھا۔
میں نہیں جانتا تھا۔
ماں نے کہا۔
خلد، میری ماں کے پیروں میں
اور
درخلد ہیں جاوید
میرے قبلہ حضور
دس اکتوبر دو ہزار دس
بطور یتیمی میری زندگی کا پہلا دن تھا۔

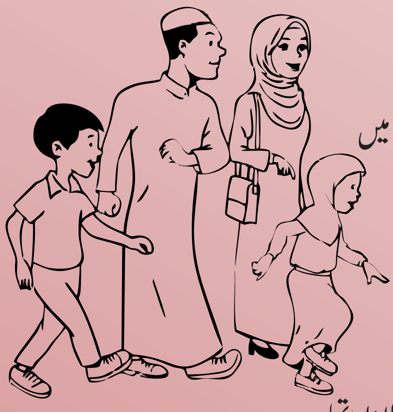

☆☆☆

محمد جاوید خادم
اوستا محمد بلوچستان

افسانہ

فنا سے بقا تک

ڈاکٹر محمد عظیم الدین
اکولہ، مہاراسٹر

وہ شخص ساحل پر بیٹھا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نگاہیں سمندر کی وسعتوں میں ڈوبی ہوئیں، ذہن سوالوں کی بھول بھلیوں میں گم۔

سمندر کی لہریں آ کر اس کے قدموں سے لپٹتیں، پھر پلٹ جاتیں، جیسے کچھ کہنا یا چھپانا چاہتی ہوں۔ اس نے گیلی ریت پر انگلی سے اپنا نام لکھا اور اسے مسلسل تکتا رہا، جیسے اپنی ہستی کا اثبات چاہتا ہو۔ مگر پھر ایک لہر آئی، خاموش، بے رحم، ستم گر اور اس کے نام کو مٹا کر چلی گئی، جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ پھٹی آنکھوں سے ریت کو تکتا رہا، پھر اٹھا، گرد جھاڑی اور ایک شکستہ دیوار کے قریب جا رکا۔ قریب سے پتھر اٹھایا اور دیوار پر اپنا نام کریدنے لگا۔ ہر لکیر میں ایک ضد اور، ایک فریاد تھی "اب کے بار، میرا نام نہ مٹانا!" مگر وقت کب کسی کی سنتا ہے۔ دن گزرے، موسم بدلا، ہوا نے بار بار اپنی نوکدار انگلیاں اس دیوار پر پھیریں، بارش نے بے دردی سے نشان دھو دیے، اور پھر ایک دن دیوار خود ہی زمیں بوس ہو گئی۔

مایوسی کے سائے اسے گھیرنے لگے، مگر وہ ضدی تھا۔ وہ پہاڑوں کے دامن میں جا پہنچا۔ اس بار اس کی ہر ضرب میں ایک جنون تھا، جیسے وہ وقت اور قدرت کو چیلنج کر رہا ہو۔ نوک دار پتھر سے چٹان پر نام کندہ کرنے لگا۔ ہر ضرب میں بے قراری تھی، ہر لکیر میں ایک فریاد۔ مگر وقت بے نیاز تھا۔ بادل برسے اور اس کی آرزوؤں کے نقوش دھندلا گئے۔ تیز ہواؤں نے پتھروں کے کناروں اور سطح کو ریزہ ریزہ کر دیا، اور موسموں کی بے رحم دست برد نے ہر نقش کو مٹا دیا۔ بالآخر وہ نام، جسے اس نے لافانی سمجھا تھا، گمنامی کی دھند میں کھو گیا۔

شکست خوردہ اور دل شکستہ، وہ ایک درویش کی تلاش میں سرگرداں ہوا، جن کی حکمت کے چرچے ہر سو تھے۔ وہ صاحبِ اسرار بزرگ، کسی ویران مزار کے گوشے میں محوِ مراقبہ تھے۔ درویش کی آنکھوں میں زمان و مکاں کا علم سمایا تھا، گویا فنا اور بقا کے مابین حائل ہر راز ان پر آشکار تھا۔

وہ شخص لرزتی آواز میں بولا،

"میں کہاں لکھوں کہ اپنا نام باقی رہے؟ دریا مٹا دیتا ہے، ہوا

اوجھل کر دیتی ہے، بارش دھوڈالتی ہے، دیواریں زمیں بوس ہو جاتی ہیں، اور پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں... اے مرشد، اب میں کیا کروں؟"

درویش نے مسکرا کر آنکھیں کھولیں اور شفقت سے اس کی طرف دیکھا، اور آہستہ سے کہا،

" کسی صاحبِ درد کے دل میں جا کر لکھوا اپنا نام... جہاں خدا کا مسکن ہے۔ اور خدا... لافانی ہے!"

وہ شخص چونک اٹھا، اور درویش کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں امید و بیم کی کیفیت تھی، اور دل ایک نئی آگہی سے لرزاں تھا۔ فضا سرگوشیوں سے معمور تھی، اور سمندر کی بے قرار لہریں بدستور ساحل سے لپٹ رہی تھیں۔

اس نے نگاہ آسمان کی جانب اٹھائی، پھر اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالی، جن پر وقت کی انمٹ نشانیاں ثبت تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن شدتِ احساس نے گویا اس کی زبان کو گنگ کر دیا تھا۔

چند لمحے یوں ہی بیت گئے۔ درویش نے پلکیں موند لیں، جیسے سب کچھ کہہ کر اپنا فرض ادا کر دیا ہو۔

وہ شخص خاموشی سے مڑا اور چل دیا۔ اس کے قدموں کے نشان ریت پر بنتے اور مٹتے رہے، لیکن اب وہ جانتا تھا کہ بقا کہاں لکھی جاتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عظیم الدین
اکولہ، مہاراسٹر

نورِ باطن

ڈاکٹر محمد عظیم الدین
اکولہ، مہاراسٹر

وادیٔ ظلمات، گویا تاریکی کی ابدی سلطنت تھی۔ یہاں نہ کبھی آفتاب کی کرن اتری، نہ کبھی صبح کی ہوا نے دھند کے سنگین حصار کو توڑا تھا۔

یہاں ہوا بھی سرگوشیوں میں خوف کی داستانیں سناتی تھی، اور ہر سایہ ایک ایسے راز کی گواہی دیتا تھا جو وقت کی دھول میں دفن ہو چکا تھا۔ یہاں ہر ذی روح اپنی ذات کے خول میں محصور تھی، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کے دل میں تلاش کی ایک نہ بجھنے والی پیاس تھی، جو انہیں زندگی کے اسرار کی گہرائیوں میں کھینچ لے جاتی تھی۔ اس وادی کے سنگلاخ راستے خطرناک گھاٹیوں سے گزرتے، ہیبت ناک چٹانیں آسمان کو چھوتیں، اور خاموشی ہر آنے والے پر خوف طاری کر دیتی۔

اس وادی کے ایک خاموش گوشے میں ایک خستہ حال جھونپڑی ایستادہ تھی۔ اس کا در ہمیشہ بند رہتا، اور اندر سے کبھی کبھار روشنی کی ایک مدھم سی لرزاں کرن جھانکتی، گویا کسی گہرے راز کی پردہ پوشی کر رہی ہو۔ لوگوں کا گمان تھا کہ وہاں ایک صاحبِ اسرار صوفی بزرگ گوشہ نشین ہیں، جو اس وادی کے تمام تاریک پہلوؤں سے آگاہ ہیں۔ لیکن اس درِ فیض تک رسائی ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی؛ کتنے ہی آرزومند یہاں آئے اور ناکام لوٹ گئے۔ یہ جھونپڑی ایک فلک بوس چٹان کے دامن میں پناہ گزین تھی، جس تک پہنچنے کے لیے ایک پرخطر اور کٹھن راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔

ایک شب، جب وادی پر سکوت کی سیاہ چادر اور بھی گہری ہو چکی تھی، ایک نوجوان اس خستہ حال جھونپڑی کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ اس کے قدموں کی آہٹ زمین کے سناٹے میں یوں جذب ہو گئی جیسے سنگِ خاموش پر کوئی آنسو گرا ہو۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی، اور اندر سے ایک نحیف اور کھردری آواز سنائی دی، "کون ہے؟"

"ایک گم شدہ مسافر، جو نور کی جستجو میں بھٹک رہا ہے،" نوجوان نے مضطرب لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز میں ایک مبہم سی امید اور ایک گہری بے چینی کا امتزاج تھا۔

دروازہ ایک کرخت چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ بزرگ کی آنکھوں میں ایک ایسی پراسرار چمک تھی جو روح میں پیوست ہو جاتی تھی۔ ان کی آنکھوں کی گہرائی صدیوں کے علم اور تجربے کی گواہی دے رہی تھی، گویا انہوں نے خود بھی اس تاریک وادی کی لامتناہی مسافتیں طے کی ہوں۔ وہ ایک مدھم جلتے چراغ کے قریب بیٹھے تھے، جس کی لرزاں لو کسی ان کہی کہانی کو چھپانے

کی کوشش کر رہی تھی۔ جھونپڑی کا اندرونی ماحول سکوت افزا اور پراسرار تھا۔ بوسیدہ دیواروں پر وقت کی دھول کی تہیں جمی تھیں اور ان پر لرزتے سائے کسی قدیم راز سے پردہ اٹھانے کے منتظر تھے۔ ہوا میں صدیوں پرانی لکڑی، خشک جڑی بوٹیوں اور فراموش شدہ یادوں کا ایک مبہم امتزاج رچا بسا تھا۔ دور کہیں سے کسی چمگادڑ کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اس سکوت کو اور بھی گہرا کر دیتی۔

"نور کی تلاش؟" بزرگ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسی گونج تھی جو نوجوان کے دل میں اتر گئی۔ "یہاں ہر کوئی نور کا متلاشی ہے، لیکن یہ نور تمہیں اس وادی کے باہر نہیں ملے گا۔ یہ تمہارے اندر ہی پوشیدہ ہے، لیکن اسے دیکھنے کے لیے تمہیں اپنے باطنی ہیبت ناک اندھیروں کا سامنا کرنا ہوگا۔"

نوجوان نے حیرت سے استفسار کیا، ''یہ کیسا سفر ہے؟'' اس کے چہرے پر تجسس اور کچھ خوف کے آثار تھے۔

بزرگ نے چراغ کی لو کو کچھ تیز کیا۔ گھٹن کم ہوئی اور سکون چھا گیا۔ "یہ سفر تمہیں تنہائی کی تاریکیوں، خوف کے سائے، اور اپنی ہی ذات کے زخموں سے گزارے گا۔ تمہیں اپنے اندر کے شیاطین سے لڑنا ہوگا، اپنی کمزوریوں کا بے رحمی سے سامنا کرنا ہوگا اور اپنی ذات کے ان رازوں سے پردہ اٹھانا ہوگا جو تمہاری روح کی گہرائیوں میں مدفون ہیں۔ اگر حوصلہ ہے تو قدم بڑھاؤ۔" بزرگ کی آواز ایک چیلنج کی مانند گونجی۔

نوجوان ایک لمحے کے لیے تھما، گویا زندگی کے کسی پیچیدہ راز پر غور کر رہا ہو۔ پھر یکا یک ارادہ مضبوط کیا اور جھونپڑی سے باہر قدم رکھا۔ جیسے ہی اس نے دہلیز پار کی، وادیِ ظلمات مزید تاریکی میں ڈوب گئی۔ ہر قدم کے ساتھ سائے طویل تر ہوتے گئے، یوں لگتا تھا کہ زمین اور آسمان کی تمام وحشتیں اس کے پیچھے لپک رہی ہوں۔ تاریکی کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، جیسے وادی کی بے کراں گہرائی اسے اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہو۔ لیکن جب کبھی خوف اس کے دل پر دستک دیتا، بزرگ کی گونجتی ہوئی آواز اس کے دل میں امید کی کرن بن جاتی: "نور کہیں باہر نہیں، تمہارے اندر ہے۔ اسے تلاش کرو، یہی تمہاری رہنمائی کرے گا۔" یہ الفاظ اُس کے وجود کو طاقت بخشتے اور یوں لگتا، جیسے اس کے دل میں کسی نئی دنیا کا سورج طلوع ہونے کو ہو۔

کئی شب و روز کی مسلسل جدوجہد کے بعد، وہ ایک گہرے کنویں کے دہانے پر پہنچا۔ کنویں کی اتھاہ گہرائی سے ایک مدھم سی سفید روشنی کی کرن نمودار ہو رہی تھی، لیکن پانی کا ساکت عکس اس قدر تاریک تھا کہ کچھ پہچاننا دشوار تھا۔ تھکن سے چور، نڈھال جسم کے ساتھ وہ کنارے پر جھکا اور پہلی بار کنویں کے ٹھہرے ہوئے پانی میں اپنا عکس دیکھا۔ مگر یہ عکس مانوس ہوتے ہوئے بھی اجنبی تھا؛ جیسے کوئی اور وجود اس پر مسلط کر دیا گیا ہو۔ ان آنکھوں میں ایک گہری چمک اور ایک پختہ عزم نمایاں تھا جو کسی نئے سفر کی نوید سنا رہا تھا۔

یکا یک، کنویں کی گہرائی سے پھوٹتا نور اس کے قلب میں اتر گیا۔ صدیوں کا سکوت ٹوٹا اور وہ نور ایک شعلے کی طرح تاریکیوں کو چیرتا ہوا اس کے وجود میں پھیل گیا۔

اب وادیِ ظلمت کی تاریکی اس کے قلب کے نور سے منور ہو چکی تھی۔ کائنات کا ہر ذرّہ اس نورِ تجلی میں نہایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ظلمت کے دبیز بادل چھٹ چکے تھے اور ہر سو نورِ ازلی کا سماں تھا۔ وہ نور جو اس کے باطن سے پھوٹا تھا، نہ صرف اس کے ماحول کو بلکہ اس کے وجود کے ہر ذرّے کو ایک نئی حیات بخش رہا تھا۔ وہ جان گیا کہ نور کہیں باہر نہیں، بلکہ انسان کے قلب میں مضمر ہے، اور جب یہ نورِ باطن بیدار ہوتا ہے تو ساری کائنات جگمگا اٹھتی ہے۔

واپسی پر جب اس نے جھونپڑی میں قدم رکھا تو اندر ہُو کا عالم تھا۔ وہ بزرگ ہستی وہاں موجود نہ تھی، ان کا کوئی نام و نشان تک نہ ملا۔ مگر ایک گوشے میں، چراغ کی لَو اب بھی پوری آب و تاب سے روشن تھی، گویا کسی نئے بھٹکے ہوئے مسافر کی راہ تک رہی ہو۔ یہ منظر محض ایک چراغ کی روشنی نہ تھا، بلکہ اُس لازوال حقیقت کی جیتی جاگتی علامت تھا کہ زندگی کے پر پیچ اور دشوار گزار سفر میں، امید اور رہنمائی کی شمع ہمیشہ متلاشی کے قلب میں فروزاں رہتی ہے؛ شرط صرف اسے دیکھنے والی نگاہِ شوق اور پانے کی سچی تڑپ ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عظیم الدین

اکولہ، مہاراشٹر

سوسال کی مسافت...........

غلام مجتبیٰ اعوان

دور کہیں سے کسی کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔۔

مدہم سی۔۔گھٹی گھٹی سی۔۔۔دبی دبی سی۔۔

وہ خود کو روک نہیں پائی اور بے اختیار اس کے قدم اس سمت بڑھنا شروع ہو گئے جہاں سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔۔بہت تیز۔۔

یہاں تک کہ اپنے قدموں کی آہٹ وہ خود سن سکتی تھی۔۔

اس کے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو رہی تھیں۔۔۔

کیفیت بیان سے باہر تھی اور چہرہ دیدنی تھا۔۔سخت سردی میں بھی اس کے ماتھے پہ پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی تھیں۔۔

یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی۔۔

اس کی نگاہوں کے سامنے عجیب تکلیف دہ منظر تھا۔

بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔۔

وہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی اس کی سانسوں کو محسوس کرتی۔۔اس میں زندگی کی جھلک تلاش کرتی وہ دیوانی سی لگ رہی تھی۔۔

جونہی اس کے آنسو اس ننھے وجود کے رخسار کو چھونے لگے اس نے آنکھیں کھولیں۔۔

درد کی شدت سے وہ آنکھیں کھول نہیں پا رہی تھی۔۔بمشکل اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے اجنبی چہرہ دیکھ کر وہ خوفزدہ سی ہوتی اپنے وجود میں سمٹ کے رہ گئی۔۔

اس نے دھیمے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس کے کمزور وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔۔

اس کی سسکیاں بلند ہونا شروع ہوئیں اور چیخوں میں بدلتی چلی گئیں۔۔

ماما۔۔بابا

پریشے۔۔زاویار۔۔۔

وہ اسی گردان کے ساتھ دوہراتی جاتی اور اپنے آس پاس متلاشی نظروں سے دیکھتی۔۔۔

کاشفہ نے اس کے ہاتھوں پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔۔

کیا نام ہے آپ کا......؟

زرنش۔۔۔وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔۔

لگ بھگ پانچ سال کی بچی تھی۔۔

کہاں سے آئی ہو؟ یہ لوگ کون ہیں جن کے نام ابھی لیے آپ نے؟

غزہ۔۔۔فلسطین۔۔۔

ماما۔۔بابا۔۔

پریشے۔۔میری بہن۔۔۔

زاویار۔۔میرا بھائی۔۔میرا بھائی۔۔۔

وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔۔

اسے یوں روتا دیکھ کر کاشفہ کے اندر بھی ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی تھی۔۔

پلیز رو نہیں۔۔

کیا ہوا تھا؟ کہاں ہیں آپ کے ماما بابا۔۔بہن بھائی۔۔

وہ۔۔وہ غزہ میں شہید ہوگئے۔۔۔

اللہ اکبر

کاشفہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔۔۔

آپ۔۔۔آپ کیسے بچ گئیں اور یہاں کیسے پہنچیں۔۔

میرے گھر والے اسرائیلی فوج کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔۔

میں گھر پر نہیں تھی۔۔اسکول کی چھٹیوں میں اپنی خالہ کی طرف گئی ہوئی تھی۔۔

میں بچ گئی............وہ مر گئے۔

وہ مر گئے...........وہ مر گئے۔

وہ روتی جاتی تھی اور اپنی ماں......باپ......بہن اور بھائی کو پکارتی جاتی تھی..................

کاشفہ نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔۔

اس کا ماتھا چوما۔۔اس کے آنسو صاف کیے۔۔

اتنے میں زرنش کو ڈھونڈتی اس کی خالہ وہاں پہنچ چکی تھی۔۔

یہ غزہ سے کافی فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔۔

زرنش کی خالہ اسے پیار کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ لے گئی۔۔

کاشفہ وہاں کھڑی کتنی ہی دیر تک یہ سوچتی رہی کہ جب یہ نسل کشی اور خونی کھیل ختم ہوگا اس کے بعد کیا ہوگا۔۔

قسمت سے اگر کوئی زرنش جیسا باقی رہ گیا تو وہ اس ٹراما سے کبھی

باہر آسکے گا؟

کیا یہ بچے پھر سے زندگی کو محسوس کرسکیں گے؟

کیا ایک نارمل انسان کی طرح اپنی زندگی میں آگے بڑھ سکیں گے۔۔؟

ان سارے سوالوں میں الجھی وہ اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔۔اور خدا گواہ تھا کہ وہ ایک ایک قدم اسے سو سال کی مسافت جیسا محسوس ہو رہا تھا۔۔

☆☆☆

منیبہ غوث

کراچی پاکستان

0335-2860194

محمد جاوید خادم

حمد

ابتدا نے انتہا چاہتا ہوں
تیری حمد و ثنا چاہتا ہوں
اے دیدہ بینا دینے والے!
میں دل بینا چاہتا ہوں
محمد ﷺ، علی، فاطمہ، حسن، حسین
پاک پنجتن کی ضیا چاہتا ہوں
رہنمائے حیات و شفائے حیات
میں نسخہ کیمیاء چاہتا ہوں
حروف دعا! منیب و تائب
میں توبتہ النصوحہ چاہتا ہوں
رب جلیل وقت نزع زباں پر
میں کلمہ طیبہ چاہتا ہوں

محمد جاوید خادم
اوستہ محمد بلوچستان
0923445092391

نعتِ نبی ﷺ

ہے صلِ علیٰ درد کے درماں کا وظیفہ
یہ وردِ جلی ہے غمِ دوراں کا وظیفہ

ہے ذکر سدا آپ ﷺ کا مقصود ہمارا
رہتا ہے یہی روح ودل وجاں کا وظیفہ

آسان ہے، انمول، بہت بیش بہا ہے
کیا خوب ہے یہ زیست کے ساماں کا وظیفہ

ہاں بعدِ خدا، ذکرِ نبی خوب کرو تم
ہے درد شناسا، دلِ حیراں کا وظیفہ

تا حشر دہن سے نہیں جائے گی حلاوت
ہے وردِ زباں، مشک بداماں کا وظیفہ

محشر میں جہنم سے دلائے گا خلاصی
بے پایاں مبارک، شہِ خوباں کا وظیفہ

بیشک گل وبلبل کا، حجر، برگ وشجر کا
ہے مہر کا، انجم، مہِ تاباں کا وظیفہ

ہاں عرشِ معلیٰ پہ ہے یہ حضرتِ حق کا
حورانِ اِرم کا ، یہی رضواں کا وظیفہ

یہ ذکر ہے لاریب یہاں شاہ وگدا کا
ہے پیر وجواں، صاحبِ ایماں کا وظیفہ

پڑھتے ہیں اسے جن وبشر اور ملائک
تا حشر ہے، یہ عرش کے مہماں کا وظیفہ

الہام شب وروز عجب دل پہ اتارے
زینب یہ تری جانِ پریشاں کا وظیفہ

سیدہ زینب سروری
اسلام آباد پاکستان
+923149996661

غزل

اختر چیمہ

اک حسن کی ملکہ سے اگر پیار نہ کرتے
موزوں کبھی اس طرح کے اشعار نہ کرتے
کچھ اہل ستم حد کو اگر پار نہ کرتے
ہم اپنے قلم کو کبھی تلوار نہ کرتے
رشتوں کا تقدس کبھی پامال نہ ہوتا
احباب اگر چھپ کے کڑے وار نہ کرتے
یوں زیب گلو طوق ملامت تو نہ ہوتا
اے کاش! کبھی عشق کا اظہار نہ کرتے
اے حسن مجسم! تری چاہت کی قسم ہے
ملتا نہ اگر تو تو کبھی پیار نہ کرتے
گر تیرے بنا ملتا سکوں قلب حزیں کو
ہر روز ملاقات پہ اصرار نہ کرتے
شاید ہمیں جینے کی تمنا ہی نہ ہوتی
اک حسن مجسم سے اگر پیار نہ کرتے
صحرائے تمنا کبھی گلزار نہ بنتا
اک پھول سے چہرے سے اگر پیار نہ کرتے
کم ظرف زمانے نے ستایا ہی بہت ہے
کیا کرتے اگر تلخیٔ اظہار نہ کرتے
ہم یوں سر بازار تماشا تو نہ بنتے
کچھ پردہ نشیں پشت پہ گر وار نہ کرتے
دل کو تری چاہت پہ بھروسا ہی بہت تھا
تو زہر بھی دیتا تو ہم انکار نہ کرتے

اختر چیمہ
سیالکوٹ پنجاب پاکستان
+923034720514

غزل

یاور حبیب ڈار

عالمِ وجد کی اس رات میں ہے
بات جو صرف تری ذات میں ہے

کیوں الجھ کے رہا ہے تار نفس
کیا دمِ گُستہ مری گھات میں ہے

سر بکف نالے شبِ تار میں کر
اک بڑی بات مناجات میں ہے

باعثِ شورشِ کونین ہوں، کیوں
کرمکِ شمع خیالات میں ہے

طائرِ قدس پڑے وجد میں یوں
جیسے کے شور نفس ساتھ میں ہے

اٹھ کھڑے ہو گئے ہیں لات و منات
دیں ہمہ اوست شہادات میں ہے

شیخ سرمد بھی ہے منصور بھی ہے
اور اناالحق بھی بیانات میں ہے

یاور حبیب ڈار
پتہ: 93, بٹہ کوٹ ہندوارہ, جموں وکشمیر
موبائل نمبر 6005929160

بہار

محمد نعیم خان

شاداں ہیں چمن زار
لو آگئی بہار
نازاں ہیں ریگ زار
لو آگئی بہار

دیکھ دشت و چمن ہیں انکے بدن
پہ سبز پیرہن کیا ہے زیب تن
گلوں کا یہ نکھار
لو آگئی بہار

پھولوں کی انجمن سرو اور گلبن
وادیاں اور بن ہیں سارے نغمہ زن
دیکھ برگ و بار
لو آگئی بہار

دھرتی کا تن بدن اور نیلگوں گگن
سحرا و گلشن ہیں بوے خوشفگن
گیتی ہے پر خمار
لو آگئی بہار

بلبل خوش نوا نرون پہ گا رہا
نغمہ یہ الفت کا ترانہ ہے خوشنما
سماں ہے خوشگوار
لو آگئی بہار

مخملیں سبزہ زار مرمریں کوہسار
بن اور مرغزار ہوگئے ہیں مشکبار
شاداب ہے دیار
لو آگئی بہار

عطر بیز ہے ہوا گلریز ہے فضا
نسیم صبح گاہ بھی ہے غزل سرا
بادل ہے گہر بار
لو آگئی بہار

طائر دلربا شوخ رنگ ہے قبا
نرالی ہر ادا اورعجب سی چھچھا
چھیڑے دل کے تار
لو آگئی بہار

شادہے باغ جہاں آسمان عطر فشاں
موسم بھی ہے جواں رنگین ہے سماں
نعیم کی ہے پکار
لو آگئی بہار

محمد نعیم خان
سیر ہمدان انت ناگ کشمیر انڈیا
9622486998

غزل

عبدل رحیم ارماں

بے مزہ دل چسپیوں کے سب ذرائع ہو گئے
ان سے اب بیزار لوگوں کے طبائع ہو گئے

بارہا ان کو ہراک محفل میں دہرایا گیا
سب کو ازبر وہ حکایات اور وقائع ہو گئے

جن کو نظروں سے چھپاکر لوگوں کے رکھا گیا
روزناموں میں وہ سب احوال شائع ہوگئے

اب ہے دنیا میں نئی صنعت اور حرفت کا عروج
بے وقت سب دور کہن کے وہ صنائع ہو گئے

صرف اب ناموں ہی سے پہچان ممکن ہوگئی
سب کے ایک جیسے ہی وضائع اور قطائع ہوگئے

وقت کی اب قدر قیمت کا ہوا احساس انہیں
بیش قیمت عمر کے جب اوقات ضائع ہو گئے

ہر دیدہ ور کی جن پہ تھی ارماں کبھی گہری نظر
ذہنوں سے معدوم وہ سب ہی روائع ہو گئے

عبدل رحیم ارمان
جالنہ مہاراشٹر
9970454702

غزل

ڈاکٹر ممتاز منور

ہم پہ اتنا ستم بتا کیا ہے
اے ستمگر تری رضا کیا ہے

دل بہلتا نہیں کسی صورت
''آخر اس درد کی دوا کیا ہے''

ہاتھ میں دوستوں کے ہے خنجر
دشمنی اس سے بھی سوا کیا ہے

ڈھونڈتے ہیں وفا کو دنیا میں
لوگ پوچھے ہیں یہ بلا کیا ہے

ظلم نے لب سیئے ہیں لوگوں کے
کیا بتائیں کہ مدعا کیا ہے

دیکھتے ہیں کہ کوئی تو دیکھے
روٹھنے کی بھی یہ ادا کیا ہے

دے رہے ہو مجھے سزا اتنی
یہ تو کہہ دو مری خطا کیا ہے

ڈاکٹر ممتاز منور
پونے۔انڈیا

نظم

سدھاکر مانوتکر

تو اپنا ہوگا

بڑی شدت سے تجھے چاہوں گا
تو افسانہ ہوگا
یوں نظروں کو چھپاؤگے تم
تو میرا سامنا ہوگا
چاہے دشمن ہو دنیا ساری
تجھے میرا ہاتھ تھامنا ہوگا
روٹھے اپنے تو کیا ہوا صنم
ایک دن قدموں میں زمانہ ہوگا
یوں ٹھوکریں تو بہت کھائی ہم نے
آج اپنا ہے کل بیگان ہوگا
کھلی کتابوں کے جیسے تھے ہم
خالی دل اور کورا پنّا ہوگا
یوں تیری جدائی کا غم سہیں گے مگر
چلو ایک دن ہی سہی تو اپنا ہوگا

سدھاکر مانوتکر
بلڈھانہ مہاراشٹر
7276975143

حاشیائی اظہار کا تخلیقی حوالہ

حاشیہ

اورنگ آباد، مہاراشٹر (انڈیا)

جولائی تا ستمبر 2025

HASHIYAA

July to September 2025

Editor : Dr. Hajra Bano

Address: Aurangabad Maharashtra, India